شیشہ ٹوٹ گیا

ایم اے راحت

میں نے اپنے والدین کو اپنی پسند سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں آمادہ کر لیا کہ وہ میرا پیغام لے کر اس کے گھر جائیں اور وہ گئے بھی اپنی محبت کے جوش میں میں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ ایک بڑے خاندان کی حسین و جمیل لڑکی ہے۔ اس کے لیے اور بھی بلکہ مجھ سے بہتر رشتے آسکتے ہیں اور وہ سچ مچ آ رہے تھے۔ میری والدہ نے بتایا کہ اس کے والدین تین رشتوں پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ جس میں تمہارا نام بھی شامل ہے مجھے اپنی محبت کے باعث تقریباً یقین تھا کہ آخر کار فیصلہ میرے حق میں ہو گا۔

ندیم

باپ کے اکلوتے اور لاڈ پیار میں پلنے والے بچے عام طور پر ضدی، خودسر اور نازک مزاج بن جاتے ہیں لیکن شہلا تمام ناز برداریوں کے باوجود بہت ذہین، سمجھدار، سلیقہ شعار اور متحمل مزاج لڑکی تھی۔ اس نے گریجویشن تک تعلیم حاصل کی مگر کالج کی آزاد فضاء بھی اس کی سنجیدگی متانت اور مشرقی شرم و حیاء پر کوئی منفی اثر پیدا نہیں کرسکی۔ وہ بہت حسین لڑکی تھی۔ ایک گرلز کالج میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس کے باوجود دل پھینک نوجوان دوسرے کالجوں سے اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے ہی منڈلاتے رہتے تھے۔ مگر شہلا نے اس سلسلے میں بھی کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کی خاندان کے اندر بھی دو تین نوجوانوں کی نگاہ شوق نے اسے منتخب کیا۔

مگر شہلا نے یہاں بھی کسی کو اس کی جائز حد سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی، اپنے اس رویے کی وجہ سے وہ نوجوانوں میں مغرور بھی جانے لگی لیکن یہ ان کی کوتاہ فہمی تھی۔ ورنہ بات صرف اتنی تھی کہ شہلا مزاجاً کسی بھی نوعیت کی فلرٹیشن کی قائل نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بی اے پاس کرنے کے بعد جب گھر اور خاندان میں اس کی شادی کا چرچا عام ہوا تو وہ اس معاملے میں قطعی غیر جانبدار تھی اور اس نے ذہن اور پوری یکسوئی سے یہ اہم فیصلہ اپنے والدین کی دوراندیش صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔

یوں تو آنے والے تمام ہی رشتے خواہ ان کا تعلق خاندان سے تھا یا خاندان سے باہر دوست احباب اور دوسرے جاننے والوں سے، سب ہی معیاری اور کم و بیش ہم پلہ تھے لیکن شیرازی صاحب اور ان کی بیگم کی نگاہ انتخاب جن تین رشتوں پر ٹھہری ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک شیرازی صاحب کی پھوپھی زاد بہن کا بیٹا فراز تھا جو آرمی میں میجر تھا اور بہت ہی لائق اور ہوشیار تھا۔ دوسرے کا تعلق ان کی بیگم کے خاندان سے تھا۔ وہ ایک بڑے زمیندار ہونے کے علاوہ تعلیم یافتہ بھی تھا اور سیاست میں بھی اس حد تک دلچسپی لیتا تھا کہ اپنے علاقے کی میونسپل کمیٹی کا چیئرمین تھا۔ تیسرا رشتہ شیرازی صاحب کے ایک عزیز دوست کے بیٹے کا تھا۔ اتفاق سے وہ بھی آرمی میں تھا۔ اگرچہ ابھی صرف کیپٹن تھا۔ مگر اس کے والدین کی مالی اور معاشی حیثیت فراز کے والدین سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے والد ایک بڑے صنعت کار تھے۔ اس رشتے میں ایک پہلو یہ بھی تھا کہ شیرازی صاحب کے دوست اور ان کا تمام خاندان بچوں کے معاملے میں بڑا زرخیز تھا اور یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ خاندان میں اس کی شمولیت سے مردم شماری کے اعتبار سے اچھا اثر پڑے گا۔

ان دنوں جب بھی شیرازی صاحب اور ان کی بیگم اس موضوع پر بات کرتے اس کا انداز کم و بیش کچھ یوں ہوتا تھا۔

"فراز اپنے خاندان کا لڑکا ہے۔ دیکھا بھالا ہے، خوب صورت ہے۔ اچھے اخلاق کا مالک ہے۔ سب لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ میرے خیال سے تو وہ ہماری شہلا کے لیے بہت موزوں رہے گا۔" شیرازی صاحب کہتے۔

"ایسے تو دلنواز بھی تو خاندان کا ہی بچہ ہے۔" بیگم جواب دیتیں۔

"بچپن میں میری نظروں کے سامنے رہا ہے۔ تعلیم یافتہ ہے سب سے بڑی بات یہ کہ بلدیہ کا چیئرمین ہے۔ اسی رفتار سے آگے بڑھتا رہا تو کسی دن وزیر بھی بن سکتا ہے۔ میرے دل کی بات پوچھیں تو اپنی اکلوتی بیٹی کو کسی فوجی سے بیاہتے ہوئے مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ وہ لوگ ہر وقت ہتھیلی پر سر لیے پھرتے ہیں۔ خدا بری گھڑی سے بچائے نہ جانے کب کیا ہو جائے۔"

"کیا باتیں کرتی ہو۔" شیرازی صاحب! مسکرانے لگتے۔ "سارے لوگ تمہاری طرح سوچنے لگیں تو سارے تو ہی کنوارے ہی رہ جائیں اس کے علاوہ کیا موت صرف فوجیوں کو ہی آتی ہے۔ جب جس کا وقت پورا ہوتا ہے۔ چلا جاتا ہے۔ چاہے فوجی ہو یا شہری۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ فوجیوں کو زیادہ خطرات لاحق رہتے ہیں۔"

"خطرات کی بات کرتی ہو تو میرے خیال سے سیاسی لیڈر فوجیوں سے زیادہ خطرات میں گھرے رہتے ہیں۔"

"آپ تو ہر بات میں بحث کرنے لگتے ہیں۔" بیگم صاحبہ بات کاٹ کر کہتیں۔ "میں پوچھتی ہوں آخر دلنواز میں کیا خرابی ہے۔"

"یہی بات میں فراز کے بارے میں کہہ سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ تیسرا پیام میرے دوست کے بیٹے کا ہے۔ فردوس صاحب میرے بہترین دوست ہیں۔ انہوں نے اس دوستی کے تعلق کو رشتے داری میں بدلنے کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے رشتے انکار کرسکوں گا۔"

یہ گفتگو بڑی دیر تک اسی انداز میں جاری رہتی اور بالآخر کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو جاتی۔ ایک مرحلے پر یہ بھی سوچا گیا کہ اچھا اگر ہم کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے تو یہ شہلا کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ آخر شادی تو اس ہی کی ہو رہی ہے ناں۔ اس کی کسی سہیلی کے ذریعے پتہ کیا جائے کہ وہ ان تینوں میں سے کسے پسند کرتی ہے اور پھر وہ جس کے حق میں فیصلہ کردے۔ اسی کا رشتہ منظور کرلیا جائے۔ یہ تجویز صرف سوچ کی حد تک نہیں رہی۔ بلکہ بیگم صاحبہ نے شہلا کی سب سے زیادہ گہری سہیلی نورین کے ذریعے تینوں امیدواروں کے فوٹو بیٹی کو بھجوا دیے۔

شہلا نے نورین کی بات خاموشی سے سنی اور ایک سرسری نظر تصویروں پر بھی ڈالی مگر آخر میں گیند پھر والدین کے کورٹ میں واپس پھینک دی میں اس کے علاوہ اور کچھ کہنا نہیں چاہتی کہ وہ میرے لیے جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔

آخر یہ اونٹ جس کسی کروٹ بیٹھتا نظر نہیں آیا تو شیرازی صاحب نے وہی کیا جو وہ ہمیشہ ایسے موقعے پر کیا کرتے تھے کہ پوری زمیندارانہ وضع سے کہہ دیا کہ بس شہلا کی شادی فراز سے ہی ہوگی۔ یہ میرا آخری اور بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا فیصلہ ہے اور یہ بات بیگم صاحبہ بھی نہ صرف جانتی تھیں بلکہ اپنے طویل دور رفاقت میں تجربہ بھی کر چکی تھیں کہ جب شیرازی صاحب اس لب و لہجے میں کوئی بات کہتے ہیں تو پھر وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتے ہیں۔

چنانچہ انہوں نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔ ویسے اس حقیقت کا اعتراف انہیں بھی تھا کہ غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو فراز سب سے بہتر امیدوار تھا۔ وہ صرف اپنے دل کے کسی گوشے میں چھپے ہوئے اس خوف کے باعث شہلا کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتی تھیں کہ کہیں یہ رفاقت کسی قربیا حادثے پر ان کی بیٹی کو تنہا نہ چھوڑ دے۔

رشتہ طے ہوگیا تو شادی کی تاریخ کا بھی تعین کرلیا گیا۔ فراز نومبر کے دوسرے ہفتے میں چھٹی لے کر آ رہا تھا اور اسے بڑی کوشش سے صرف دو ہفتے کی چھٹی ملی تھی۔ اس لیے طے کیا گیا۔ انیس نومبر کو شادی اور بیس نومبر کو ولیمہ کر دیا جائے یہ بھی فیصلہ کرلیا گیا کہ شہلا فوری طور پر فراز کے ساتھ ہی نہیں جائے گی بلکہ کچھ مدت کے بعد جب فراز کو زیادہ بہتر اور کشادہ رہائش گاہ مل جائے گی تب وہ اسے ساتھ لے جائے گا۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ شہلا بابل کے گھر سے رخصت ہو کر سسرال آ گئی جہاں اس کا استقبال بڑے پیار و محبت سے کیا گیا۔ یہ گھر ویسے بھی اس کے لیے انجانا نہیں تھا۔ مگر اب

جس طرح اسے خوش آمدید کہا گیا۔ اس کا تو انداز ہی جدا اور بڑا دلفریب تھا۔ پھر شب عروسی کی سحر ہونے سے پہلے ہی شہلا نے قلب و ذہن کی گہرائیوں سے محسوس کرلیا تھا کہ اس کے والدین نے اس کے حق میں زندگی کا بہترین فیصلہ کیا ہے۔ فراز اسے ہر اعتبار سے پسند ہی نہیں بلکہ بہت پسند آیا تھا۔ اگلے دو تین دن' جس سرخوشی' ایک ایسی سحر زدہ خوابی کیفیت اور بے پایاں مسرتوں کے درمیان گزرے کہ اپنے جذبات کا الفاظ میں اظہار شہلا کے لیے ممکن ہی نہ تھا۔

شہلا نے فراز کو کس جذباتی کیفیت میں الوداع کہا ہوگا۔ اس کیفیت کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے عزیزوں کے علاوہ خود فراز نے بھی اسے سمجھانے اور تسلی دینے میں کوکسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ محاذ جنگ پر وہ جس قدر بھی مصروف ہو۔ جس حالت میں بھی ہو پوری کوشش کرے گا کہ وہ اگر روز نہیں تو ہر دوسرے دن اسے خط لکھ کر اپنی خیریت سے آگاہ کرتا رہے۔

مگر شہلا کیا کرتی اس کے ذہن میں تو وہ تمام خدشات ابھرا ابھر کر آرہے تھے جو شادی سے پہلے اس کی ماں کسی فوجی سے شادی کرنے کے سلسلے میں بار بار دہراتی رہتی تھیں۔ فراز نے اس کی جانب سے منہ پھیر کر اپنے گھر سے باہر قدم نکالا اور باہر منتظر کار میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن روانہ ہوا۔ تب نجانے کس آواز نے شہلا کے کان میں سرگوشی کی کہ اب وہ زندگی میں پھر کبھی فراز کو نہیں دیکھ سکے گی۔

☆☆

فراز کو ڈیوٹی پر حاضر ہوتے ہی۔ محاذ جنگ پر مشرقی پاکستان بھیج دیا گیا کہ دشمن نے بنگالی پناہ گزینوں کے بہانے کی آڑ اور اپنی پروردہ تنظیم مکتی باہنی کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں ہی مملکت خداداد کو دو ٹکڑے کرنے کی سازش تیار کی تھی۔

شہلا بڑی بے چینی سے اس کے پہلے خط کی منتظر تھی۔ جو کہ چوتھے دن موصول ہوا۔ اس میں فراز نے اپنی خیریت سے مطلع کرنے کے علاوہ وہ پتا بھی لکھا تھا۔ جس پر وہ جواب دیئے سے اسے ملنے کا زیادہ امکان تھا۔ اس نے پورے خط میں کہیں یہ ذکر نہیں کیا تھا کہ اسے مشرقی پاکستان کے کس محاذ پر تعینات کیا گیا ہے۔ مگر بڑے عزم اور حوصلے کا اظہار کرتے ہوئے اس نے ایک بار نہیں کئی بار یہ الفاظ دہرائے تھے کہ پروردگار کی تائید و نصرت سے دشمن کو ایسا منہ توڑ جواب دیا جا رہا ہے اور دیا جاتا رہے گا کہ وہ پھر کبھی مادر وطن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکے گا۔

شہلا خط لکھتے ہی جواب لکھنے بیٹھ گئی اور اس کے بعد ہر روز ایک خط لکھتی رہی اس نے بعد کے خطوط میں مختلف مواقع پر کھینچے گئے اپنے اور فراز کے وہ فوٹو بھی روانہ کیے جن کے پرنٹ فراز کی موجودگی میں تیار ہو کر نہیں آئے تھے۔ فراز بھی اپنے وعدے کے مطابق دوسرے تیسرے دن جواب دیتا رہا۔ یہ سلسلہ بہ مشکل تین چار خطوط تک قائم رہنے کے بعد اچانک فراز کی جانب سے منقطع ہو گیا۔ شہلا پھر بھی اسی پابندی کے ساتھ خط لکھتی رہی لیکن فراز کی طرف سے ان کی کوئی رسید موصول نہیں ہوئی۔ یہ صورت حال نہ صرف شہلا بلکہ تمام عزیز و اقارب کے لیے پریشان کن تھی۔ مگر سوائے دعاؤں کے اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔

تب پھر ایک رات فوجی ہائی کمان کی جانب سے یہ خبر موصول ہوئی کہ میجر فراز علی شدید جنگ کے دوران لاپتا ہیں اور ان کے بارے میں مختلف شواہد کی بنیاد پر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ دشمن سے دلیرانہ مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

یہ المناک خبر خاندان کے افراد پر تو ایک بجلی بن کر گری ہی تھی لیکن شہلا کے وجود پر تو ایک قیامت کی طرح ٹوٹی وہ تقریباً دو ہفتے تک ہوش و حواس سے بیگانہ رہی اور پھر جب اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو اسے چپ سی لگ گئی۔ کوئی اس کا دل بہلانے مختلف موضوعات پر باتیں کرنے کی کتنی ہی کوششیں کرتا۔ وہ ایک حیرت آمیز سکوت کے ساتھ خالی خالی نظروں سے اسے اپنے گرد و پیش کو دیکھتی رہی۔ کسی بات کا کوئی جواب نہ دیتی۔ زبردستی یا بہلا پھسلا کر کچھ کھلا پلا دیا جاتا تو کھا لیتی مگر کبھی خود سے خواہش کا اظہار نہ کرتی۔

شیرازی صاحب اور ان کی بیگم اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کی یہ حالت دیکھتے تو ان کا کلیجہ کٹنے لگتا۔ آخر ڈاکٹروں کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ شہلا کو ان در و دیوار اور اس ماحول سے نکال کر کہیں اور لے جایا جائے۔ کسی ایسی جگہ جہاں اسے نظر نظر اور قدم قدم پر فراز کی یاد تازہ اور برقرار رکھنے کی کوئی بات کوئی شے نہ ہو۔

تب شیرازی صاحب نے مستقل طور پر کسی دوسرے شہر منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر فراز کے والدین سے درخواست کی کہ ان کا لاڈلا تو شہادت کے رتبے پر فائز ہو کر چلا گیا لیکن ان کی اکلوتی بیٹی ابھی زندہ ہے اور زندگی کو زندگی کے تمام تقاضوں کے ساتھ گزارنا اس کا حق ہے۔ حال تو ہاتھوں سے نکل گیا مگر اب وہ اس کا مستقبل برباد نہیں کرنا چاہتے۔ اس لیے فراز کو بھلانے میں شہلا کی مدد کریں۔ اس کی پنشن یا جرات کے صلے میں کوئی اعزاز دیا جائے تو اسے اپنی حد تک رکھیں۔ بلکہ سمجھ لیں کہ شہلا اور فراز کی شادی کبھی ہوئی ہی نہیں تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو پل پل مرتے نہیں دیکھ سکتے اس کے لیے ایک نئی زندگی کی تلاش میں اسے ایبٹ آباد لے جا رہے ہیں۔

جنگ بند ہوئی۔ اپنوں کی بے وفائی اور غیروں کی سازش کے نتیجے میں ملک دولخت ہو گیا۔ پوری اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ نوے ہزار مسلمان سپاہیوں اور بڑوں کو دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی شرمناک ذلت اٹھانا پڑی۔ آفتاب شیراز اپنا آبائی گھر چھوڑ کر اس طرح ایبٹ آباد آ بسے کہ پھر پلٹ کر ادھر نہیں دیکھا۔ نیا گھر' نیا ماحول' نئے پڑوسی نئے دوست احباب' نئے رابطے اور نئی دلچسپیاں' شہلا کی طبیعت رفتہ رفتہ سنبھلتی گئیں۔

یہاں تک کہ چھ سات ماہ گزرنے کے بعد وہ اس المیے کے اثرات سے تقریباً آزاد ہو چکی تھی۔ پورے ماحول کی تبدیلی نے بڑا مثبت اثر ڈالا تھا۔ پھر شاید شاید شہلا کے تحت الشعور نے خود ان تکلیف دہ یادوں سے فرار حاصل کرنا چاہا نتیجہ یہ نکلا کہ ابھی یہاں آئے ہوئے سال بھر بھی نہیں گزرا تھا کہ شہلا نے اس حادثے کو کسی پریشان خواب کی طرح فراموش کر دیا۔

فطری بات تھی کہ شیرازی صاحب اور ان کی بیگم شہلا کی اس تبدیلی سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے ازراہ دور اندیشی شروع سے ہی شہلا کو کنوارہ ظاہر کیا تھا اب اسے دوبارہ زندگی اور اس کی امنگوں سے ہمکنار دیکھا تو ملنے جلنے والوں سے گفتگو کے دوران موقع و محل کی مناسبت سے یوں جیسے برسبیل تذکرہ کچھ کیا جا رہا ہو۔ اس طرح کی باتیں کی جانے لگیں کہ ہم نے مولا کے دربار سے جو مانگا سو پایا۔ اب تو بس یہی خواہش باقی ہے کہ خدا بیٹی کے فرض سے بھی خوش اسلوبی سے سبکدوش کر دے یا یہ کہ آتی جاتی سانس کا کیا بھروسہ نہ جانے کب رک جائے جی چاہتا ہے۔ آنکھیں بند ہونے سے پہلے خدا کے گھر کی زیارت نصیب ہو جائے مگر جب تک شہلا اپنے گھر کی نہ ہو جائے کیسے جا سکتے ہیں۔

شہلا جیسی لڑکی کے لیے رشتوں کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔ بہت سی نگاہیں تو اسے پہلے سے پسند کر چکی تھیں مگر صرف اس خیال سے متذبذب تھیں کہ اس جیسی لڑکی کے لیے رشتوں کی کمی تھی یقیناً کسی

نے اسے مانگ لیا ہوگا۔ کیا پتا شیرازی صاحب اپنے خاندان میں کہیں اس کی منگنی کر چکے ہوں اور انہیں منہ سے بات نکال کر شرمندہ ہونا پڑے۔ اب جو اشارہ ملا تو یکے بعد دیگرے کئی اچھے موزوں رشتے آ گئے۔ ان میں ڈاکٹر شہزاد کا رشتہ جو ایک بہت شریف و نجیب مگر متوسط درجے کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شیرازی صاحب اور ان کی بیگم کو بیک وقت پسند آ گیا اور غالباً ان کی پوری ازدواجی زندگی کا پہلا فیصلہ تھا جو دونوں نے کسی بھی اخلاقی بحث کے بغیر پورے انشراح صدر اور مکمل ازدواجی ہم آہنگی سے کیا۔

شادی کی تقریب بہت سادگی سے انجام پائی۔ جس کے لیے دونوں فریق اپنی اپنی مصلحت کے تحت آمادہ ہو گئے۔ ڈاکٹر شہزاد کے والدین تو متوسط طبقے سے منسلک ہونے کی وجہ سے کسی دھوم دھام کے متحمل ہی نہیں ہو سکتے تھے اور شیرازی صاحب نے سادگی کو اس لیے ترجیح دی کہ اس طرح یہ تقریب نسبتاً چھوٹے حلقے تک محدود رہے گی اور یوں شہلا کی پہلی شادی کی بات جسے انہوں نے اب تک بڑی کامیابی کے ساتھ پوشیدہ رکھا تھا۔ ظاہر ہونے کے امکانات نسبتاً کم ہوں گے۔

اپنے نتائج کے اعتبار سے یہ شادی بہت کامیاب ہوئی۔ شہزاد بہت متحمل، منکسر المزاج، شریف اور سمجھدار نوجوان تھا۔ اس نے اپنے والدین کی کم مائیگی کے سبب نہ صرف ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم اپنی ذاتی محنت اور جدوجہد سے حاصل کی تھی۔ بلکہ ڈاکٹر بننے کے بعد بڑا ہونے کے باوجود اپنی شادی کا مسئلہ اس وقت تک موخر رکھا۔ جب تک اپنی دو چھوٹی بہنوں کو ان کے اپنے گھروں میں آباد کرنے میں کامیاب نہیں ہو گیا۔

شہلا میں حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ پچھلی یادوں کو وہ تقریباً فراموش کر چکی تھی۔ اس لیے ایک نئے رفیق زندگی کے ساتھ اس نے سفر حیات کا آغاز بڑے خلوص اور وفاداری کے جذبے کے ساتھ کیا اور یوں بہت جلد اپنے شوہر کے دل میں ہی نہیں بلکہ پورے سسرال میں محبت و احترام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

مسرتوں کے اس نئے دور کے آغاز میں صرف ایک ہی افسوسناک بات وقوع پذیر ہوئی شیرازی صاحب کی عام صحت بہت اچھی تھی۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہیں صرف اٹھاون سال کے لگ بھگ تھی اور ان کے خاندان میں اوسط عمر کو دیکھتے ہوئے بھی یہی خیال تھا کہ ان کا سایہ ابھی مزید بیس پچیس سال خاندان کے سروں پر قائم رہے گا۔ مگر تقدیر کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ ایک رات بالکل اچانک ہی ان پر فالج کا دورہ پڑا اور اسی دورے کے عالم میں دماغ کی کوئی رگ پھٹ جانے سے ان کی موت واقع ہو گئی۔ تب ڈاکٹر شہزاد اور شہلا کی شادی کو تقریباً دس ماہ گزر چکے تھے۔

غم کتنا ہی شدید نوعیت کا کیوں نہ ہو۔ انسانی فطرت گزرتے وقت کے ساتھ رفتہ رفتہ اسے بھول جاتی ہے اور اب تو اس دکھ کو ہلکا کرنے میں مدد دینے کے لیے ڈاکٹر شہزاد جیسا ساتھی موجود تھا۔ شہلا نے اپنی عمر کے اس دوسرے المیے کو بھی انگیز کر لیا۔ اب چونکہ ماں گھر پر تنہا رہ گئی تھیں۔ اس لیے شہلا اور شہزاد دونوں نے بڑے اصرار کے بعد انہیں اپنے ساتھ رہنے پر آمادہ کر لیا۔

اس مدت میں ملک میں سیاسی طور پر بھی کئی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ مشرقی پاکستان' بنگلہ دیش کے نام سے ایک الگ ریاست بن چکا تھا۔ پاکستان میں اگرچہ ایک سیاسی پارٹی کی حکومت تھی۔ مگر ساتھ ساتھ مارشل لاء بھی نافذ تھا۔ بیرون ملک دباؤ اور طول وطویل مذاکرات کے بعد بھارت نے بالآخر بھارت نے پاکستان کے نوے ہزار قیدیوں کو رہا کر دیا تھا اور وہ اپنے وطن واپس آ چکے تھے۔ ان میں سے بیشتر کو مسلح افواج میں کھپا لیا گیا۔ کچھ کو ریٹائر کر دیا گیا اور کچھ نے از خود ریٹائرمنٹ لے لی۔ اس میں بہت سے افراد وہ بھی شامل تھے جو کسی معذوری کے باعث مزید فوجی خدمت ادا کرنے کے قابل نہیں تھے۔ پہلے سال کے دوران۔

میجر فراز کے والدین نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح انہیں اپنے اکلوتے بیٹے سے انجام کا پتہ چل جائے۔ فوجی ہائی کمان نے اسے دوران جنگ لاپتا ظاہر کرتے ہوئے اس کے شہید ہو جانے کے یقین کا اظہار کیا تھا۔ اس بیان میں غمزدہ والدین کے لیے خوش فہم اندازوں کی تھوڑی بہت گنجائش موجود تھی۔ جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ بار بار فوجی حکام سے رجوع کرتے تھے۔ فوجی قیدیوں کی واپسی کے وقت انہوں نے ایک بار پھر حکام سے رابطہ قائم کیا۔ مگر اس مرتبہ بھی وہی جواب ملا جو پیشتر دیا جاتا رہا تھا۔ بلکہ جلد ہی ایک تمغہ شجاعت دینے کا اعلان کر کے میجر فراز کی شہادت کو باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا گیا۔

صبح کے تقریباً دس بجے کا وقت تھا۔ شہزاد اپنے کلینک جا چکا تھا۔ شہلا ملازمہ کو دوپہر کے کھانے کے بارے میں ہدایات دے رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شہلا یہ خیال کرتے ہوئے کہ فون شہزاد کا ہو گا اور وہ حسب معمول یہ اطلاع دے گا کہ وہ آج بھی دوپہر گھر نہیں آ سکے گا۔ ریسیور اٹھا لیا۔

ادھر چند ہفتوں سے شہزاد اپنے کلینک کو رفتہ رفتہ ایک چھوٹا سا پرائیویٹ اسپتال بنانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ چند سال پہلے جس عمارت کی ایک دکان میں اس نے اپنا کلینک کھولا تھا۔ اب اس نے اس عمارت کے پورے گراؤنڈ فلور کو کرائے پر حاصل کر لیا تھا۔ مزید دو ڈاکٹروں اور کئی نرسوں کی خدمات حاصل کر کے اس نے مریضوں کو داخل کرنا شروع کر دیا تھا اور بڑھتی ہوئی مصروفیت میں اب عموماً یہ ہونے لگا تھا کہ وہ صبح نو بجے کا گھر سے نکلا ہوا مغرب کے بعد واپس آتا تھا۔

لیکن شہلا کا اندازہ غلط تھا۔ دوسری جانب سے ابھرنے والی آواز شہزاد کی نہیں تھی۔

''ہیلو'' کسی اجنبی مردانہ آواز نے کہا۔

''کیا یہ ڈاکٹر شہزاد کا گھر ہے۔''

''جی ہاں۔'' شہلا نے حیرت سے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا میں مسز شہلا شہزاد سے بات کر سکتا ہوں۔''

''میں بول رہی ہوں۔ فرمایئے۔''

''میرا نام کیپٹن فرخ ہے۔'' دوسری طرف سے جواب ملا۔ ''آپ مجھے نہیں جانتیں' مگر میں آپ سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔''

''وہ کس طرح۔''

''آپ کے شہید شوہر میجر فراز میرے بہت قریبی دوست اور افسر اعلیٰ تھے۔ ہم دونوں ایک ہی محاذ پر نبرد آزما تھے۔''

''ضرور ہوں گے۔'' شہلا سرد لہجے میں بولی' لیکن میری زندگی کا وہ باب ختم ہو چکا ہے۔''

''کیا میں اس کا مطلب یہ سمجھوں کہ آپ کو اپنے پہلے شوہر کے آخری لمحات کے جاننے کے بارے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''جی نہیں۔''

''لیکن ان چیزوں سے تو ضرور ہو گی جو انہوں نے اپنی وصیت کے ساتھ میرے سپرد کی ہیں۔''

''کیسی چیزیں۔'' شہلا چونکی۔

''مثال کے طور پر آپ کے وہ خطوط اور فوٹو جو آپ نے میجر صاحب کو بھیجے تھے شہلا کو ایک لمحے کے لیے اپنے دل کی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ گزرے دنوں میں بھی ایک لمحے

کے لیے بھی اس کے گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ اس کے لکھے ہوئے خطوط اپنے موصول کنندہ کے ساتھ ختم نہیں ہو گئے ہوں گے۔"

"وہ...... وہ تمہارے پاس کیسے آئے۔" بے اختیار شہلا کے منہ سے نکلا۔

"میں نے عرض کیا ناں کہ خود میجر صاحب نے مجھے دیے تھے۔"

"تو پلیز انہیں ضائع کر دیں' جلا دیں' پھاڑ دیں' مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ممکن ہے آپ کو نہ ہو۔" بولنے والے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"مگر کسی اور کو تو ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر شہزاد کو......"

شہلا سے فوری طور پر کوئی جواب نہ بن پڑا۔ فرخ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ شہلا کو معلوم تھا کہ شہزاد اس کی پہلی شادی سے ناواقف ہے۔ اب اگر فرخ وہ خطوط اور فوٹو گراف لے کر شہزاد کے پاس پہنچ جائے تو اس فریب پر شہزاد کو غصہ بھی آ سکتا ہے۔ وہ خود ایک سچا آدمی تھا اور سچائی کو پسند کرتا تھا۔ اب اسے پتہ چلے کہ اس سے جھوٹ بولا گیا تھا۔ تو غصے میں اس کا ردعمل کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مگر ایک سوال یہ بھی تھا کہ یہ فرخ کون ہے اور اگر وہ واقعی فراز کا دوست تھا تو فراز نے اسے اپنے پرائیویٹ خطوط اور تصویریں کیوں دی تھیں۔

"تم نے بتایا کہ وہ خطوط اور فوٹو گراف تمہیں میجر فراز نے دیے تھے۔" شہلا نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"درست ہے۔" جواب ملا۔

"اور یہ کہ وہ تمہارے دوست تھے۔"

"صرف دوست نہیں بہترین دوست تھے۔ ساتھ ہی آفیسران کمانڈ بھی محاذ پر میں ان کے ساتھ تھا۔"

"مگر انہوں نے یہ چیزیں تمہیں کیوں دی تھیں۔"

"تاکہ اگر وہ دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو جائیں تو میں یہ امانت آپ تک پہنچا دوں۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ خطوط اور فوٹو تم مجھے بھیج دو۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتا کیوں کہ مجھے تاکید کی گئی ہے کہ یہ چیزیں دستی طور پر تمہارے سپرد کروں۔"

"اچھی بات ہے۔ تم نے ہمارا بنگلہ دیکھا ہے۔" شہلا نے پوچھا۔

"یقیناً بلکہ اس وقت میں آپ کے بنگلے سے چند قدم ہی کے فاصلے سے آپ کو فون کر رہا ہوں۔"

"اچھا تو ابھی آ جاؤ اور میری امانت مجھے دے دو۔"

"ضرور لیکن میجر صاحب نے اس کے ساتھ ایک وصیت بھی کی تھی۔ ان چیزوں کی واپسی اس وصیت کے ساتھ مشروط ہے۔" فرخ نے جواب دیا۔

"وصیت...... کیسی وصیت۔" شہلا چونکی

"دیکھیے اتنی اہم اور وضاحت طلب گفتگو ٹیلیفون پر کرنا مناسب نہیں ہے۔" فرخ نے کہا۔ "کون جانے اس وقت کوئی اور مثال کے طور پر ڈاکٹر شہزاد آپ کو فون کر رہے ہوں اور فون کو مسلسل انگیج پا کر نہ جانے کیا سوچیں۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ آپ مجھے اپنی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع دیں۔ صرف اسی طرح تفصیلی گفتگو ہو سکتی ہے اور آپ کو اپنے ہر سوال کا اطمینان بخش جواب مل سکتا ہے۔"

شہلا گھبرا گئی۔ فرخ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ اس کی کال کو شہزاد کا فون سمجھ کر ہی ریسیور کرنے آئی تھی۔ کیا پتا شہزاد اس وقت سچ مچ فون کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے گہری سانس لی۔ "تم ابھی آ سکتے ہو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔

سردی جا رہی تھی۔ مگر ابھی ہوا بھی خنکی غالب تھی۔ کم سے کم اتنی گرمی نہیں تھی کہ شہلا کے ماتھے پر پسینہ آ جاتا' مگر آ گیا تھا یہ علامت تھی اس بات کی کہ فرخ کے فون نے اسے پریشان اور خوفزدہ کر دیا ہے۔ بظاہر اس کی باتوں سے صرف بلیک میل کا اندیشہ کیا جا سکتا تھا لیکن شہلا کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ خطرہ بلیک میلنگ سے بھی زیادہ اور کچھ اور ہے۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے پسینہ خشک کیا اور قدم بڑھایا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجتے پر وہ پلٹی' یہ فرخ تو نہیں ہو سکتا تھا۔ ریسیور اٹھانے سے قبل صرف ایک پل کے لیے وہ ہچکچائی پھر ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"میں تقریباً پندرہ بیس منٹ سے فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔" شہزاد کی آواز ابھری۔ "مگر مسلسل انگیج ٹون مل رہی تھی۔ کیا امی کا فون آیا تھا۔"

شہزاد کے والدین اس کے ساتھ نہیں رہتے تھے۔ وہ ابھی تک اپنے آبائی گھر میں فروکش تھے۔ جب شہزاد نے اپنے کلینک کو اسپتال میں تبدیل کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد شروع کیا تو بعض کاروباری سہولیات کے پیش نظر ایک پوش علاقے میں اچھا مکان کرائے پر لے لیا تھا۔

شہلا شہزاد کے سوال کے جواب میں کوئی فوری بہانہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شہزاد نے اپنی ماں کا ذکر کیا تو گویا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہاتھ آ گیا۔ جلدی سے بولی۔ "جی ہاں' امی نے ہی فون کیا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ وہ کتنی کتنی دیر تک باتیں کرتی رہتی ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" شہزاد نے جواب دیا۔ "بہرحال میں نے اس لیے فون کیا ہے کہ میں آج بھی دوپہر کو نہیں آ سکوں گا۔"

"کوئی نئی بات نہیں یہ تو اب آپ کا معمول بنتا جا رہا ہے۔"

"مجبوری ہے۔ اسپتال کی وجہ سے مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے اور ابھی آمدنی اتنی نہیں ہوئی کہ میں ایک دو ڈاکٹر اور رکھ سکوں۔"

"میں جانتی ہوں۔ اس لیے مجھے کوئی شکایت بھی نہیں ہے۔"

"شکریہ...... مجھے بھی تم سے اسی انڈر اسٹینڈنگ کی توقع ہے۔ شام کو جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔" شہزاد نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

شہلا نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی' فرخ نے کہا تھا کہ وہ مکان کے قریب ہی کہیں سے فون کر رہا ہے یہ سچ تھا۔ وہ کسی بھی لمحے آ سکتا تھا اور شہلا نہیں چاہتی تھی کہ ملازمہ اس کی آمد سے واقف ہو۔ چنانچہ وہ اٹھی کچن میں جا کر ملازمہ کو مزید کچھ ہدایات دیں اور پھر مکان کے بیرونی برآمدے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ فرخ کو کال بیل بجانے سے روکنا چاہتی تھی۔ ابھی اسے آئے ہوئے دو تین منٹ ہی گزرے تھے کہ گیٹ کھلا اور ایک نوجوان آدمی اندر داخل ہوا۔

وہ اچھی صحت اور واجبی صورت کا ایک ایسا آدمی تھا۔ جس کے سپاٹ چہرے سے اس کے خیالات اور قلبی تاثرات کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے یوں اس کے خدوخال میں بھی بحیثیت مجموعی کوئی ایسی بات تھی جو شہلا کے دل میں نفرت اور خوف کا ملا جلا تاثر پیدا کر رہی تھی۔

نووارد نے برآمدے میں شہلا کو دیکھ لیا تھا۔ یوں لگا جیسے وہ مسکرانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تو آپ میرا انتظار کر رہی تھیں۔" وہ قریب آتے ہوئے بولا۔ "اچھا ہے۔ سر دست میں خود بھی نہیں چاہتا کہ آپ کے گھر میں کسی کو میری آمد کا علم ہو۔ مگر گفتگو کے لیے یہ جگہ مناسب

نہیں ہے۔ کیا ہم کسی کمرے میں نہیں بیٹھ سکتے۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' شہلا نے اپنا لہجہ سرد رکھا۔

وہ فرخ کو ڈرائینگ روم میں لے گئی۔ اسے فون کرنے والا فرخ ہی تھا۔ اسے اس بات کا یقین ہو چکا تھا۔ فون پر اس کی آواز سن کر شہلا نے جو ذہنی خاکہ قائم کیا تھا یہ آدمی اس پر پورا اترتا تھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' شہلا نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ وہ خط اور فوٹو تمہارے پاس کیسے آئے نیز اس وقت وہ کہاں ہیں۔''

''دونوں چیزیں ایک محفوظ جگہ رکھی ہیں۔''

''ساتھ کیوں نہیں لائے۔ تم نے تو کہا تھا کہ مجھے دستی طور پر دینا چاہتے ہو۔''

''مگر میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میجر صاحب کی وصیت کے مطابق ان کی واپسی ایک شرط کے ساتھ ہوگی۔'' فرخ نے کہا۔ ''آپ نے وہ شرط پوری کر دی تو اسی وقت آپ کی امانت آپ کے حوالے کر دی جائے گی۔''

''کیسی شرط۔'' شہلا نے پوچھا۔

''آپ میری گفتگو کا پس منظر اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اس کے لیے مجھے کچھ تفصیل میں جانا ہوگا۔''

''جو کچھ کہنا چاہتے ہو ذرا جلدی سے کہہ ڈالو۔ میں اپنا وقت ضائع کرنے کا عادی نہیں ہوں۔''

''میں اور میجر فراز ایک ہی محاذ پر تھے۔'' فرخ نے بتایا۔ ''میں جیسور کے محاذ پر بھیجا گیا تھا۔ میں ابتداء میں میجر صاحب کو صرف اپنے آفیسر کی حیثیت سے جانتا تھا۔ ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ معلومات نہیں تھیں لیکن محاذ جنگ پر ہماری یک جائی نے ہمارے درمیان افسر اور ماتحت کے تعلق سے آگے بڑھ کر دوستانہ روابط پیدا کر دیے۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ جنگ شروع ہونے سے کچھ پہلے ہی ان کی شادی ہوئی تھی اور یہ کہ کہاں اور کس سے ہوئی تھی۔ فطری طور پر دوران جنگ جب بھی فرصت کے تھوڑے سے لمحات میسر آتے تھے میجر صاحب آپ کا ذکر کرنے لگتے تھے۔ پھر آپ کے خطوط بھی بڑی پابندی سے آ رہے تھے جو آپ کی یاد تازہ رکھنے کے علاوہ میجر صاحب کے لیے بڑا جذباتی سہارا بنے ہوئے تھے۔ میجر صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کی اور آپ کی شادی ہرچند محبت کی نہیں تھی مگر شادی کے بعد وہ آپ سے بے پناہ محبت کرنے لگے تھے۔''

''اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شہلا نے تیزی سے کہا۔

''میرے خیال میں ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر آپ میجر صاحب کی وصیت کا مطلب نہیں سمجھ سکیں گی۔'' فرخ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ایک دن محبت کے موضوع پر بات کرتے ہوئے میجر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے بھی کبھی کسی کو چاہا ہے۔ جنگ جس انداز سے ہو رہی تھی۔ اس کے پیش نظر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ہم میں سے کسی کو واپس جانے کا موقع ملے گا بھی یا نہیں۔ چنانچہ میں نے جواب دیا کہ میجر صاحب اگر آپ عام حالات میں مجھ سے یہ سوال کرتے تب شاید میرا جواب کچھ اور ہوتا لیکن اب جبکہ ہم میں سے کوئی بھی کسی لمحے دشمن کے کسی بم یا گولی کا نشانہ بن سکتا ہے۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔

ہاں میں نے بھی کسی کو چاہا ہے اور بہت ٹوٹ کر چاہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میں جس سے محبت کرتا تھا اور محبت کرتا ہوں۔ اسے میرے جذبات کا کوئی علم نہیں۔ میں اسے تب سے چاہتا ہوں۔ جب وہ کالج میں پڑھتی تھی اور میں اسے بڑی پابندی سے کالج آتے جاتے صرف ایک نظر دیکھنے کی کوشش میں کبھی کبھی گھنٹوں انتظار کرتا رہتا تھا۔ میں چاہتا تو اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوئی صورت نکال سکتا تھا لیکن میں اسے شریفانہ انداز میں والدین کی اجازت سے اپنانا چاہتا تھا۔ اس لیے اپنی محبت دل میں چھپائے خاموشی سے مناسب وقت کا انتظار کرتا رہا۔ خوش قسمتی سے مجھے آرمی میں کمیشن مل گیا۔ جس کے بعد مجھے اپنی کامیابی کی زیادہ توقع ہوگئی۔

میں نے اپنے والدین کو اپنی پسند سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں آمادہ کر لیا کہ وہ میرا پیغام لے کر اس کے گھر جائیں اور وہ گئے بھی اپنی محبت کے جوش میں میں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ ایک بڑے خاندان کی حسین و جمیل لڑکی ہے۔ اس کے لیے اور بھی بلکہ مجھ سے بہتر رشتے آ سکتے ہیں اور وہ سچ مچ آ رہے تھے۔ میری والدہ نے بتایا کہ اس کے والدین تین رشتوں پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ جس میں تمہارا نام بھی شامل ہے مجھے اپنی محبت کے باعث تقریباً یقین تھا کہ آخر کار فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔ مگر بدقسمتی سے ایک اور امیدوار کے حق میں فیصلہ ہو گیا جو اس کا رشتہ دار بھی تھا اور بہ لحاظ عہدہ مجھ سے فائق بھی چنانچہ اس کی شادی اس کے ساتھ ہو گئی اور میں ہاتھ ملتا رہ گیا۔ میجر صاحب ذہین اور سمجھدار آدمی تھے۔ ہر چند میں نے اس لڑکی کا نام نہیں لیا تھا۔ مگر شاید انہیں کچھ شبہ ہو گیا اور انہوں نے اس کا نام جاننے پر اتنا اصرار کیا کہ مجھے بتانا پڑا کہ اس کا نام شہلا ہے۔''

''کیا۔'' شہلا چونک پڑی۔ ''یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔''

''یہ بکواس نہیں حقیقت ہے۔'' فرخ نے جواب دیا۔ ''اور وہ شہلا تم ہی ہو۔ شاید تمہیں یاد ہو کہ تمہارے والدین نے جب وہ خود کسی فیصلے پر پہنچنے سے قاصر رہے تھے تو تم سے تین رشتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنے کے لیے کہا تھا۔ ان تین میں ایک میرا بھی تھا۔ تمہارے والد اور میرے ڈیڈی کے درمیان بڑے گہرے دوستانہ مراسم تھے اور انہی کی دوستی کی وجہ سے مجھے یقین تھا کہ کامیابی مجھے ملے گی۔ مگر مجھے مسترد کر دیا گیا۔''

''وہ تیسرا رشتہ تمہارا تھا!'' شہلا نے حیرت سے کہا۔ ''تم انکل فردوس علی کے بیٹے ہو۔''

''ہوں نہیں تھا۔'' فرخ نے جواب دیا۔ ''میرے ڈیڈی بھی اسی جنگ میں شہید ہو چکے ہیں۔''

''ممکن ہے تم سچ کہہ رہے ہو لیکن اگر یہ جانتے ہو کہ امی باجی نے میری رائے پوچھی تھی تو تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے خود کسی کے حق میں رائے دینے کے بجائے فیصلہ ان پر ہی چھوڑ دیا تھا۔''

''میں یہ بھی جانتا ہوں اور اسی لیے اب زیادہ پرامید ہوں۔''

''کیا مطلب۔'' شہلا نے فرخ کو گھورا۔

''مطلب ابھی واضح ہو جائے گا۔'' فرخ نے جواب دیا۔

''بہرحال جب میجر صاحب کو یہ حقیقت معلوم ہوئی تو انہوں نے بڑی عالی ظرفی اور کشادہ دلی کا ثبوت دیا۔ میرے لیے رشک و رقابت کے جذبات محسوس کرنے کے بجائے انہیں مجھ سے گہری ہمدردی ہو گئی۔ پھر ایک دن بدقسمتی سے دشمن کے تازہ حملے کے دوران ان کے بازو میں گولی لگ گئی۔ ہم نے دشمن کا وہ حملہ تو پسپا کر دیا لیکن ہمارا جانی نقصان بھی بہت ہوا تھا۔ ہمیں احساس تھا کہ اب اگر دشمن نے پھر یلغار کی تو شاید ہم اسے نہ روک سکیں۔ تب پھر میجر صاحب نے تنہائی میں مجھ سے کہا۔

''کیپٹن مجھے اپنی شہادت کا یقین ہو چکا ہے اور میرے اندر کوئی آواز مجھے یہ بھی بتا رہی ہے کہ خدا نے چاہا تو تم سلامت رہو گے یہ سچ ہو یا غلط مگر میں اپنی ایک امانت تمہارے سپرد کرنا چاہتا

ہوں اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے بڑی احتیاط سے بندھا ہوا ایک پیکٹ مجھے دیا۔ کہنے لگے کیپٹن اس میں شہلا کے خطوط اور اس کے بھیجے ہوئے فوٹو ہیں اسے تم اپنے پاس رکھو۔ اگر میں کام آجاؤں اور خدا تمہیں زندہ وطن واپس پہنچا دے تو میری یہ امانت شہلا کو دے دینا۔ مجھے امید ہی نہیں یقین ہے کہ وہ میری واپسی کا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں شہلا سے تمہاری پاکیزہ محبت کا بہت احترام کرتا ہوں۔ اس بنا پر اگر میں نہ رہوں تو اس پر تمہارا حق فائق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں تمہیں اور شہلا دونوں کو محبت کرتا ہوں کہ میرے بعد تم دونوں شادی کر لینا۔ اگر شہلا کو کوئی اعتراض ہو تو اس سے یہ کہنا کہ جو محبت اسے مجھ سے ہے۔ میں اس محبت کا واسطہ دے کر یہ چاہتا ہوں کہ میری موت کے بعد وہ تم سے شادی کر لے۔''

''مگر......'' شہلا نے بات کاٹنا چاہی۔

''میں نے بھی میجر صاحب کے اس فیصلے پر بہت احتجاج کیا تھا۔'' فرخ نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ ''میں نے اس سے کہا تھا کہ ضروری نہیں کہ میں زندہ بچ جاؤں اس پر انہوں نے جواب دیا کہ ایسی صورت میں تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں جو خدا چاہے گا ہو جائے گا۔ میں نے جو وصیت کی ہے اور جو امانت تمہارے سپرد کی ہے۔ وہ قابل عمل تو اسی صورت میں ہوگی کہ میں کام آجاؤں اور تم زندہ رہو۔ جہاں تک وصیت کا تعلق ہے۔ اس کا فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ اس لیے اس بارے میں مجھ سے بحث مت کرو ظاہر ہے اس کے بعد میرے لیے خاموشی کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔''

فرخ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ شہلا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

''پھر یہ ہوا۔'' فرخ نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ''کہ اسی رات دشمن نے پھر حملہ کیا۔ اس کے ٹینک سے برسایا ہوا ایک گولہ میجر سے تقریباً پانچ گز کے فاصلے پر آ کر پھٹا۔ اس کے بارود کی ایک لپٹ میجر صاحب کے منہ پر لگی۔

ان کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ چہرے کا بایاں نصف حصہ مع ایک آنکھ کے ضائع ہو گیا۔ مگر آفرین ان کی جوانمردی پر کہ انہوں نے جھپٹ کر ٹینک بے کار کر دیے مگر اس بار دشمن تازہ کمک کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا۔ ہمیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے میجر صاحب کو گنجان جنگل میں غائب ہوتے دیکھا۔ بس اس کے بعد ان کا کوئی پتہ نہیں چلا۔

میں دشمن کی قید میں پھنس گیا۔ اس کے دو دن بعد پورے مشرقی پاکستان میں ہماری نوے ہزار فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ میں زخمی تھا۔ کئی ہفتے ریڈ کراس کے اسپتال میں رہا۔ تندرست ہونے پر مجھے بھی بھارت منتقل کر دیا گیا۔ جہاں قیدیوں کے ایک کیمپ میں رہا۔

میجر صاحب کے بارے میں سرکاری طور پر ان کی شہادت کا یقین کر لیا گیا۔ مگر یہ بھی سننے میں آیا کہ ہمارے جو فوجی برما کی طرف فرار ہو گئے تھے میجر فراز بھی ان میں شامل تھے۔ بہرحال جب ہمیں رہائی ملی اور ہم پاکستان آئے تو میں نے آرمی سے ریٹائرمنٹ لے لیا اور اب میجر صاحب کے حکم کی تعمیل میں آپ کے پاس آیا ہوں' یہ ہے میری پوری داستان اس سے آگے جو کچھ کرنا یا کہنا ہے۔ آپ کو کرنا ہے۔''

فرخ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ مگر اتنی دیر میں شہلا بخوبی سنبھل چکی تھی۔

''میجر فراز زندہ ہوں یا جنگ میں کام آ گئے ہو۔ ان کا میری زندگی سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''تم نے جو کچھ کہا وہ سچ ہو یا جھوٹ میرے لیے بے کار ہے۔ ڈاکٹر شہزاد سے میری شادی ہو چکی ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔ مگر میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' فرخ نے جواب دیا۔ ''خطوط اور فوٹو صرف اسی صورت میں تمہارے حوالے کیے جائیں گے کہ جب تم میجر صاحب کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے مجھ سے شادی کر لو۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو۔'' شہلا کو غصہ آ گیا۔ ''میں کسی اور کی بیوی ہوتے ہوئے تم سے کیسے شادی کر سکتی ہوں۔''

''کر سکتی ہو۔'' فرخ بڑے اطمینان سے بولا۔ ''ڈاکٹر شہزاد سے طلاق یا خلع حاصل کرنے کے بعد۔''

''میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔''

''اس صورت میں۔'' فرخ کھڑا ہو گیا۔ ''مجھے اب ڈاکٹر شہزاد سے بات کرنا ہوگی۔ اس کا جو نتیجہ نکلے گا۔ اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ڈاکٹر شہزاد بہت شریف انسان ہیں' بردبار' نرم خو بھی ہیں لیکن ان کو جھوٹ اور فریب سے سخت نفرت ہے۔ وہ کسی ایسی صورت میں شدید ردعمل کا اظہار کرتے آئے ہیں۔ یہ بات تم بھی جانتی ہو۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ تم نے اور تمہارے والدین نے ان کو دھوکہ دیا تھا۔ وہ تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکیں گے۔''

شہلا جانتی تھی کہ فرخ جو کچھ کہہ رہا ہے صحیح کہہ رہا ہے۔ خود شہزاد اس سے کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ انہیں سب سے زیادہ غصہ جھوٹ بولنے اور دھوکہ دینے پر آتا ہے۔ سال سوا سال کی مختصر رفاقت میں شہلا اس کی کئی مثالیں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ کلینک کا ایک کمپاؤنڈر دواؤں کے حساب کتاب میں گڑبڑ کر رہا تھا۔ شہزاد نے نہ صرف خود اسے بری طرح مارا بلکہ اس کے ہاتھ پیر جوڑ کر معافی مانگنے کے باوجود پولیس میں دے دیا۔ اسی طرح کئی ماہ قبل ان کے ایک عزیز دوست نے اپنی مالی پریشانی کا ایک جھوٹا بہانہ گھڑ کر ان سے پانچ لاکھ روپے قرض لے لیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ مقروض ضرور تھا۔ مگر اس کی وجہ وہ نہیں تھی جو اس نے بیان کی تھی۔ شہزاد کو اس بات پر اتنا غصہ آیا کہ ہمیشہ کے لیے اس سے تعلقات منقطع کر لیے۔

اگرچہ اس نے بعد میں کسی نہ کسی طرح قرض کی رقم بھی ادا کر دی لیکن شہزاد نے اسے معاف نہیں کیا۔ چنانچہ یہ عین ممکن تھا کہ حقیقت معلوم ہونے پر شہزاد اسے طلاق دے دیں یا پھر ہمیشہ کے لیے ترک تعلق کر لیں۔

''تم کیوں مجھے برباد کرنے پر تلے ہوئے ہو۔'' شہلا روہانسی ہو گئی۔

''میں صرف میجر صاحب سے کیے ہوئے وعدے پر عمل کرنا چاہتا ہوں۔''

فرخ نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ''بربادی یا آبادی تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ ڈاکٹر شہزاد سے خلع حاصل کر کے مجھ سے شادی کر لو۔ کوئی ذلت و رسوائی نہ ہوگی اور میرے پاس اتنی دولت ہے کہ ساری زندگی آرام و سکون سے گزار سکتی ہو۔ دوسری صورت میں شہزاد تمہیں یقیناً طلاق دے دے گا۔ مگر ساتھ ہی رسوائی بھی ہوگی۔ اگرچہ میں اس صورت میں بھی تم سے شادی کر لوں گا لیکن تم اپنی ضد پر اڑی رہیں۔ تب بلاشبہ تمہاری بربادی لازمی ہوگی اور ساری زندگی کے لیے ہوگی۔''

''تت......تم مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت نہیں دے سکتے۔'' مجبوراً شہلا کو کہنا پڑا۔

''ضرور دے سکتا ہوں۔'' فرخ دروازے کی طرف چلا۔ ''تم اچھی طرح غور کر لو۔ اب میں ایک ہفتے کے بعد تم سے رابطہ قائم کروں گا۔ امید ہے کہ تم ہر پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کرو گی۔''

دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے وہ ذرا رکا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا۔

''یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں بلف کر رہا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''اور میرے پاس میجر فراز کے دیے ہوئے خطوط اور فوٹو نہیں ہیں' ثبوت کے

لیے میں اپنے ساتھ تمہارے ایک خط اور ایک فوٹو کی فوٹو کاپی لیتا آیا ہوں۔ تم اسے دیکھ کر میری سچائی کا یقین کر سکتی ہو۔"

اس نے ایک لفافہ ہوا میں اچھال دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ شہلا نے اس کے جاتے ہی لپک کر لفافہ پکڑ لیا اندر دو کاغذ رکھے تھے اور بلاشبہ ان میں سے ایک کاغذ پر شہلا کے ان خطوط میں سے ایک کی نقل موجود تھی جو اس نے فراز کو لکھے تھے۔ دوسرے کاغذ پر فوٹو اگرچہ صاف نہیں تھا۔ مگر یہ ان کئی تصویروں میں سے ایک تھا جو شہلا نے فراز کو روانہ کی تھیں۔ شہلا نے کانپتے ہاتھوں سے دونوں کاغذ پرزے پرزے کر دیے۔ ان پرزوں کو ڈسٹ بن میں پھینک کر وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر پلنگ کر کر آنسو بہانے لگی۔

☆☆

شہزاد کئی دنوں سے اپنے والدین سے ملنے نہیں جا سکا تھا۔ اس روز صبح فون پر شہلا سے گفتگو کے دوران ماں کا ذکر آیا تو اس کے ساتھ اس کوتاہی کا احساس بھی ابھرا۔ جانا اس دن بھی مشکل ہی تھا۔ سوچا کہ چلو آج فون پر خیر و عافیت معلوم کر لی جائے اور جانے کا پروگرام آئندہ اتوار کو مناسب رہے گا۔ تاکہ وہ شہلا کو بھی ساتھ لے جائے۔ یہ فیصلہ کر کے وہ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مصروف ہو گیا۔

تیسرے پہر کے قریب اسے کچھ مہلت ملی تو اس نے ایک قریبی ریسٹورنٹ سے کچھ سینڈوچز اور چائے منگوائی اور جب تک یہ چیزیں آئیں۔ اس نے اپنے پرانے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ مگر جواب میں اسے انگیج ٹون سنائی دی۔

اس نے ریسیور رکھ دیا اور پانچ منٹ بعد دوبارہ کوشش کی۔ مگر اب بھی انگیج ٹون ہی آ رہی تھی۔

سینڈوچز کھانے اور چائے پینے کے دوران اس نے دو تین بار پھر کوشش کی مگر بات نہیں ہو سکی۔ وہی ٹوں ٹوں کی آواز رابطے میں حائل رہی۔ شہزاد کو کچھ حیرت ضرور ہوئی مگر اس نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ چار بجے کے بعد اسے ایک آپریشن کرنا تھا۔ اس لیے دوبارہ فون کرنے کا موقع مغرب کے بعد اس وقت ملا جبکہ وہ رات کی ڈیوٹی پر آنے والی ڈاکٹر کاظمی سے ضروری اور توجہ طلب مریضوں کے بارے میں گفتگو کر کے گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیا اور اس بار بھی اسے انگیج ٹون ہی سنائی دی تو اس نے مزید وقت ضائع نہیں کیا اور گھر جاتے ہوئے راستے میں والدین کی خیریت معلوم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ویسے وہ خیر و عافیت کے بارے میں فکرمند نہیں تھا۔ بلکہ اس خیال سے جا رہا تھا۔ کہ پالی ماں سے کہہ سکے' امی آپ فون پر زیادہ دیر تک باتیں نہ کیا کریں کہ کوئی اور آپ کو فون کرنا چاہے تو اسے ہمیشہ آپ کا نمبر انگیج ہی ملے۔

ماں اسے دیکھ کر خوش ہو گئیں اور بتایا کہ تمہارے ابو عشاء کی نماز پڑھنے مسجد گئے ہیں۔ شہزاد نے اپنی خیریت بتائی۔ ان کی معلوم کی زیادہ دیر نہ ٹھہرنے پر معذرت کی اور جب چلنے لگا تو ذرا شوخ لہجے میں بولا۔ "امی آپ فون پر بڑی لمبی گفتگو کرتی ہیں۔ پتا ہے دوپہر سے برابر آپ سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر جب بھی نمبر ڈائل کیا تو انگیج ٹون سنائی دی۔"

"وہ تو سنائی دینا ہی تھی۔" ماں نے جواب دیا۔ "ہمارا فون تین دن سے خراب ہے۔ تمہارے ابو نے کمپلینٹ بھی کی تھی۔ مگر ابھی تک تو ٹھیک ہوا نہیں ہے۔"

"آپ کا فون تین دن سے خراب ہے۔" شہزاد نے چونکتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی جو پہلا خیال اس کے ذہن میں آیا' ظاہر ہے وہ یہ تھا تھا کہ اگر امی کا فون خراب تھا۔ تو وہ شہلا کو فون کیسے کر سکتی ہیں اور اگر انہوں نے فون نہیں لیا تو شہلا نے جھوٹ کیوں بولا۔ "اگر وہ امی کے علاوہ کسی اور سے بات کر رہی تھی تو بتا دیتی۔ اسے چھپایا کیوں اور وہ فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے جس کے لیے شہلا کو جھوٹ بولنا پڑا۔"

"کیا سوچنے لگے۔" ماں نے ٹوکا۔

"کچھ نہیں۔" شہزاد نے فوراً سنبھلتے ہوئے کہا۔ "آپ کا فون خراب ہے۔ اسی لیے انگیج ٹون مل رہی تھی۔ آپ ابو سے کہہ دیں کہ اگر کبھی فون خراب ہو اور کمپلینٹ کریں تو یہ ضرور بتا دیں کہ یہ ایک ڈاکٹر کا فون ہے۔ اس طرح جلدی ٹھیک ہو جایا کرے گا۔ اچھا امی اب چلتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو اتوار کو شہلا کے ساتھ آؤں گا۔"

وہ سلام کر کے گھر سے باہر آ گیا۔ اس نے اپنی ماں کو یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ صبح شہلا نے ان سے گفتگو کرنے کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ پہلے وہ اپنے طور پر جاننا چاہتا تھا کہ آخر شہلا نے یہ غلط بیانی کیوں کی تھی۔

شہلا نے اپنے معمول کے مطابق مسکراتے ہوئے شہزاد کا استقبال کیا۔ مگر کوئی بھی گہری نظر رکھنے والا دیکھ سکتا تھا کہ اس کی مسکراہٹ پر جبر غالب ہے۔ وہ زبردستی ہنسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جبکہ اس کی آنکھوں میں کسی انجانے خوف کا تاثر اس تبسم کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ شہزاد نے بظاہر اس کی یہ کیفیت نظر انداز کر دی۔ خیریت کے رسمی فقروں کے تبادلے کے بعد وہ لباس تبدیل کرنے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور شہلا کچن کی جانب چل دی کہ ملازمہ کو کھانا میز پر لگانے کے لیے کہہ دے۔

کھانے کے دوران بھی شہزاد نے محسوس کیا کہ شہلا اپنے آپ کو بشاش ظاہر کرنے کی پوری کوشش کرنے کے باوجود کسی نہ کسی وجہ سے ذہنی طور پر پریشان اور الجھی ہوئی ہے۔

"صبح امی نے فون پر کوئی خاص بات تو نہیں بتا دی۔ اس سے یہ نہ پتا چلا۔"

"امی نے فون پر......" شہلا چونک پڑی۔

"ہاں۔ جب میں نے فون کیا تھا۔ تب تم نے بتایا تھا کہ امی کا فون آیا تھا۔"

"اوہ...... ہاں نہیں کوئی خاص بات تو نہیں کی تھی۔ بس وہی پرانی شکایت کر رہی تھیں کہ اب ہم لوگ بہت کم آتے ہیں گویا انہیں بھولتے جا رہے ہیں۔" شہلا سنبھل کر بولی۔

"یہ بات تو ہے۔" شہزاد نے مسکرا کر بات ٹالنے کی کوشش کی۔ "میرا خیال ہے۔ اس بار ہم تقریباً ایک ماہ سے نہیں گئے ہیں۔ کیوں نہ اگلے اتوار کو چلیں۔"

"ضرور چلیں میں تو کہتی ہوں ہر ہفتے جائیں۔ آپ ہی کو فرصت نہیں ملتی۔" شہلا نے بڑی آمادگی سے کہا۔

شہزاد خاموش ہو گیا۔ شہلا نے اس وقت بھی اپنی غلط بیانی کی تائید کی تھی وہ کچھ پریشان بھی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ضرور ہوئی ہے لیکن کسی نامعلوم وجہ سے شہلا اس سے یہ بات چھپانا چاہتی ہے اگلے دو دن کم و بیش اسی انداز میں گزرے بلکہ شہلا کچھ زیادہ کھوئی کھوئی سی لگنے لگی تھی۔ پھر بھی شہزاد نے اس سے کوئی بات نہیں کی اس کی خواہش تھی کہ اگر کوئی پریشانی ہے تو شہلا کو خود اس پر اعتماد کرتے ہوئے ظاہر کر دینی چاہیے تھی۔

تیسرے دن صبح دس بج کر پانچ منٹ پر فون کی گھنٹی پھر بجی۔

اس دن کے بعد سے شہزاد نے فون کرنا بند کر دیا تھا۔ اسی رات ان کے درمیان بات ہو چکی تھی کہ چونکہ اسپتال میں مصروفیت بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے شہزاد دوپہر کے کھانے کے لیے نہیں آ سکتا اور جب یہ بات طے ہو گئی تو روزانہ فون کر کے نہ آنے کے لیے معذرت کرنے کی

ضرورت جاتی رہی۔ یہ الگ بات تھی کہ شہزاد نے فون کرنا بند نہیں کیا تھا۔ وہ دس ساڑھے دس بجے کے دوران جب بھی موقع ملتا گھر کا نمبر ڈائل کرتا۔ اس وقت شہلا عموماً ادھر ادھر ہوا کرتی تھی۔

☆☆

''میں اس سلسلے میں تمہیں یا تمہارے مرحوم والد کو قطعی قصوروار نہیں ٹھہراتا میں زیادہ دن ٹھہرنے کے ارادے سے بھی نہیں آیا۔ عنقریب چہرے کی پلاسٹک سرجری کے لیے امریکہ جا رہا ہوں لیکن جانے سے پہلے میرا تم سے ملنا بے حد ضروری ہے۔ میں اسٹار ہوٹل کے کمرہ نمبر ۲۲۶ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ تم کسی وقت آسانی کے ساتھ مجھ سے ملنے آ سکتی ہو۔''

شہلا نے انتہائی کوشش کے بعد خود پر اتنا قابو پایا کہ کچھ سوچنے اور بولنے کے قابل ہو سکے۔

''آپ...... آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''یہ بات میں فون پر نہیں بتا سکتا۔''

''اور اگر...... میں نہ آ سکوں۔''

''تمہیں آنا پڑے گا۔'' لہجے میں تھوڑی سختی آ گئی تھی۔ ''میں کہہ چکا ہوں کہ میں نہ کسی کو اپنے زندہ ہونے کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں اور نہ ہی یہاں میرا قیام دو تین دن سے زیادہ رہے گا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ میں تمہارے لیے کوئی پریشانی پیدا کرنا نہیں چاہتا لیکن تمہارا مجھ سے ملنا بے حد ضروری ہے۔ اس لیے اگر تم نہ آئیں تو مجھے مجبوراً وہ کچھ کرنا پڑے گا جو میں کرنا نہیں چاہتا۔ اس کے علاوہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں مجھ سے صرف ایک ملاقات کرنے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

''آپ کو جو کچھ کہنا ہے۔ وہ...... فون پر نہیں کہہ سکتے۔''

''نہیں۔'' سختی میں کہا گیا۔

''میں...... میں گھر میں سے زیادہ دیر غیر حاضر نہیں رہ سکتی۔ ڈاکٹر شہزاد میرے شوہر دوپہر کا کھانا گھر پر کھاتے ہیں اگر انہوں نے۔''

''اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' فراز نے بات کاٹی۔ ''لیکن گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں زیادہ دیر تک نہیں روکوں گا۔ مجھے اپنی بات کہنے میں نصف گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔''

''آپ نے کیا کہا تھا۔ آپ کہاں ٹھہرے ہیں۔'' شہلا نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

''اسٹار ہوٹل کمرہ نمبر دو سو چھبیس یہ دوسری منزل پر ہے۔'' فراز نے جواب دیا۔ ''تم نے اسٹار ہوٹل تو دیکھا ہوگا۔''

''جی ہاں دیکھا ہے۔''

''پھر کتنی دیر میں آ رہی ہو۔''

''تیس، چالیس منٹ میں ٹیکسی جلدی نہ ملی تو دیر بھی ہو سکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' فراز نے جواب دیا۔ ''ایک بات اور جیسا کہ میں نے بتایا میرے نصف چہرے پر توپ کے ایک گولے سے شدید زخم آئے تھے۔ وہ زخم اگرچہ بھر چکے ہیں مگر میری صورت اتنی بگڑ گئی ہے کہ دیکھنے والے ڈر جاتے ہیں اس لیے میں ہمہ وقت ایک غلاف نما نقاب چہرے پر پہنے رہتا ہوں۔ تمہیں خود کو اس نظارے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر کے آنا ہوگا۔ ویسے کمرے میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہوگا۔''

☆☆

شہلا پینتیس منٹ میں مقررہ مقام پر پہنچ گئی۔ اس نے بہت سادہ لباس پہن رکھا تھا اور میک اپ بھی اتنا ہلکا کیا تھا کہ غور سے دیکھنے پر ہی محسوس ہوتا تھا۔ اس سے اس کا مقصد یہی تھا کہ وہ

دیکھتے ہیں اسی عالم کی نظر [illegible]
اس کی جانب نہ اٹھے نہ کسی کو کوئی ایسی نمایاں بات محسوس ہو کہ وہ اسے یاد رکھ سکے۔ اپنی قوت ارادہ مضبوط کرتے ہوئے وہ بغیر کسی جھجک کے ہوٹل کے اندر داخل ہو گئی۔ قدرے لمبی راہداری کے بعد فوراً استقبالیہ کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔

مگر وہ ذرا بھی جھجکے یا رکے بغیر کاؤنٹر کے سامنے سے گزرتی چلی گئی۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا کلرک کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک سرسری نگاہ شہلا پر ڈالی اور پھر دوبارہ رسالے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ استقبالیہ کاؤنٹر سے آگے بڑھتے ہی ایک کشادہ سی صحن نما جگہ تھی۔ دائیں جانب ایک زینہ اوپر جا رہا تھا۔

دن کے ایک حصے میں ہوٹل کے اندرونی حصوں میں آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ شہلا کو دوسری منزل پر پہنچنے تک کوئی بھی شخص راستے میں نہیں ملا۔ وہ نمبر تلاش کرتی ہوئی آگے بڑھی بیشتر کمروں کے دروازے بند اور مقفل تھے۔ کمرا نمبر چھبیس ایک راہداری کے تقریباً آخر میں واقع تھا۔ اسے دستک دینے کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔ جیسے ہی وہ کمرے کے سامنے پہنچی اندر سے آواز آئی۔

''دروازہ کھلا ہے۔ تم اندر آ سکتی ہو۔''

شہلا ایک بار پھر اپنا حوصلہ استوار کرتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا سامنے ایک آرام دہ کرسی پر کوئی دروازے کی جانب سے پشت کیے بیٹھا تھا۔

''دروازہ بند کر دو۔'' اسی آواز نے کہا۔

شہلا نے پلٹ کر دروازے کے کھلے ہوئے پٹ بند کر دیے کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔

ہر چند کہ شہلا کو بتا دیا گیا تھا کہ کمرے میں اسے کسی قسم کے نظارے کی توقع رکھنا چاہیے پھر بھی شہلا کے رگ و پے میں سرد لہر سی اترتی چلی

وقامت عام جسم اور صحت فراز ہی کی طرح تھا۔ اتنا ہی نہیں اس نے اس وقت جو قمیض اور پتلون پہن رکھی تھی اسے بھی شہلا نے پہچان لیا۔ فراز اپنے ساتھ جو دو تین جوڑے کپڑے لے گیا تھا۔ موجودہ لباس بھی ان میں شامل تھا لیکن لیکن...... فراز سے یہ مشابہت شانوں تک پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے اوپر ایک سفید غلاف سا تھا جو سر سے کندھوں تک آ رہا تھا اور اس غلاف میں آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے۔ جن کے پیچھے سے سیاہ چمکدار آنکھیں جھانکتی نظر آ رہی تھیں۔ ٹیلیفون پر صرف آواز اور اپنا نام سن کر شہلا کو یقین تو تھا کہ یہ آواز صرف فراز کی ہو سکتی ہے۔ پھر بھی ایک شبہ سا تھا کہ شاید وہ فراز نہ ہو لیکن اب اسے اپنے سامنے دیکھ کر شہلا کو یقین ہو گیا کہ یہ فراز کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

''تمہارے آنے کا شکریہ۔'' فراز نے کہا۔ ''اطمینان سے اسی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔''

شہلا نے دیکھا کہ کمرے کی مشرقی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی میز اور اس کے قریب ہی ایک کرسی پڑی ہے وہ خاموشی سے اس کرسی پر بیٹھ گئی۔ قدرے گھبراہٹ کے باوجود اپنی کرسی اور فراز کے درمیان کافی فاصلہ شہلا کو اطمینان دلا رہا تھا۔

''جیسور کے محاذ پر ہم نے دشمن کے کئی حملے پسپا کر دیے تھے۔'' فراز نے کہا۔

''مگر آخری حملے میں میں بری طرح زخمی ہو گیا۔ میرا نصف چہرہ توپ کا ایک گولہ قریب ہی پھٹنے سے لہولہان ہو گیا تھا۔ ہمارے پاس ہٹنے یا جان دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں ہوش میں ہوتا تو یقیناً شہادت کی موت کو ترجیح دیتا لیکن چہرے پر بے شمار زخم کھانے کے بعد میں بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ پھر ہوش آیا تو دیکھا کہ میرے چند

ساتھی مجھے دشمن کے نرغے سے نکال لائے ہیں ہم اس وقت ایک کشتی میں سفر کر رہے تھے۔

اور کشتی کا رخ ایک دوسرے ملک کی جانب تھا۔ خدا جانے وہ کشتی میرے ساتھیوں کے ہاتھ کیا سے لگی لیکن یہ طے تھا کہ اگر ہم خشکی کے راستے بھاگتے تو جلد یا بدیر یا تو مارے جاتے یا دشمن کی قید میں آ جاتے۔ ہم نا معلوم جگہ پہنچ کر ایک چھوٹے میں چھپے رہے۔ وہیں پر ایک بدھ بھکشو نے اپنی جڑی بوٹیوں سے میرا علاج کیا اور میں بچ گیا۔ اگرچہ چہرہ اتنا خراب ہو گیا تھا۔ اتنا بگڑ گیا تھا کہ میں خود آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ تب میں ہر وقت چہرے پر سفید پٹیاں لپیٹے رکھتا تھا۔ پھر ہماری فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔

میں اور میرے پانچ ساتھی تقریباً ڈیڑھ سال تک اسی گاؤں میں چھپے رہے۔ میں اس وقت اپنے چہرے کی وجہ سے اتنی مایوسی اور افسردگی کا شکار تھا کہ میں نے کسی کو بھی اپنے زندہ بچ جانے کی اطلاع نہیں دی۔ پھر حالات ذرا نارمل ہوئے بنگلہ دیش بن گیا شملہ معاہدہ ہو گیا قیدی فوجیوں کی واپسی کے انتظامات ہونے لگے۔ تب ہم ساتھیوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا اور جس کا جس طرف دل چاہا روانہ ہو گیا۔ میں ایک دشوار گزار راستے سے پہلے نیپال پہنچا اور پھر اپنے طور پر انتظامات کر کے پاکستان واپس آ گیا۔ یہ میرے زندہ بچ جانے کی داستان ہے۔''

فراز کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ شہلا پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اصولاً اس کے دل کا اندرونی خوف کم ہونا چاہیے تھا۔ مگر کوئی بات تھی جو برابر اسے خوفزدہ کیے جا رہی تھی۔

''محاذ جنگ پر میرے ماتحتوں میں ایک نوجوان کیپٹن فرخ بھی تھا۔'' فراز نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ''ہمارے درمیان بہت جلد گہری دوستی ہو گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ شادی کے تیسرے دن جدا ہو جانے کا اثر تم پر کیا ہوا تھا لیکن میں ہمہ وقت تمہیں یاد کرتا رہتا تھا۔ تمہارے خطوط میرے لیے بڑا جذباتی سہارا تھے اور وہاں جنگ کے میدان میں اپنے دل کی باتیں کہنے کے لیے مجھے فرخ کی صورت میں ایک بہترین ساتھی مل گیا۔

مگر پھر ایک عجیب بات معلوم ہوئی۔

پتا چلا کہ وہ خود بھی تمہارے امیدواروں میں سے تھا۔ اپنے والدین کے ذریعے پیام بھی بھجوایا تھا لیکن کامیابی اس کے بجائے میرے مقدر میں لکھی تھی۔ مجھے اس پر بڑا رحم آیا۔ اس سے گہری ہمدردی پیدا ہو گئی۔ وہ تمہاری شادی ہو جانے کے باوجود تم سے محبت کرتا تھا اور خود اس نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جس دن دشمن نے اپنا آخری حملہ کیا ہے۔ اس سے پہلے میں تھوڑا زخمی ہو چکا تھا اور نجانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں میدان جنگ سے زندہ نہیں لوٹوں گا۔ تب میں نے تمہارے بھیجے ہوئے تمام خطوط اور فوٹو فرخ کے حوالے کر دیے کہ اگر میں کام آ جاؤں اور وہ بچ جائے تو یہ امانت تم تک پہنچا دے اس سے میں نے ایک اور بات بھی کہی تھی لیکن اس کا ذکر کچھ بعد میں کروں گا۔''

فراز ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ شہلا کا دل چاہا کہ وہ فراز کو بتا دے کہ جو دوسری بات اس نے فرخ سے کی تھی۔ وہ اسے معلوم ہو چکی ہے۔ مگر اندر سے وہ کچھ ایسی سہمی ہوئی تھی کہ زبان سے کھولنے کا حوصلہ نہ کر سکی۔

''آگے بڑھنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ ذرا اپنی اور تمہاری موجودہ پوزیشن کی وضاحت کر دوں۔'' فراز نے ایک بار پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''دینی اور شرعی طور پر صورت حال یہ ہے۔ اس کے بارے میں جس عالم یا مفتی سے چاہو فتویٰ لے لو کہ میں تمہارا پہلا شوہر بہ فضل خدا زندہ ہوں اور میری موجودگی میں۔ ڈاکٹر شہزاد سے تمہاری شادی سراسر ناجائز اور حرام ہے۔ لاعلمی میں جو کچھ ہوا وہ ہو چکا لیکن اب تمہارا دوسرا نکاح باطل ہو چکا ہے اور آج کے بعد تم ڈاکٹر شہزاد کے ساتھ رہو گی تو یہ حرام کاری اور گناہ عظیم ہو گا۔ مگر میں پوری ایمانداری سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ اپنا چہرہ خوفناک حد تک بگڑ جانے کے بعد اگر میں خود کو تم پر مسلط رکھوں تو بڑا ظلم ہو گا۔

بلاشبہ میں پلاسٹک سرجری کروانے امریکہ جا رہا ہوں لیکن کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ میرے انتہائی بگڑے ہوئے چہرے پر پلاسٹک سرجری کامیاب بھی ہو گی یا نہیں اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں آزاد کر دوں۔ تمہیں طلاق دے دوں اور یہ طلاق ایک شرط کے ساتھ ہو گی۔''

فراز نے اتنا کہہ کر پھر خاموشی اختیار کر لی۔ شہلا کو خود بھی معلوم تھا کہ فراز کے زندہ ہونے کی وجہ سے اس کی دوسری شادی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ پھر اس مسئلے پر فراز کے اگلے فقروں سے اسے کچھ اطمینان سا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ فراز کے خیالات جان کر اس کے دل میں اس کے لیے تعریف کا جذبہ بھی ابھرا لیکن طلاق کے ساتھ شرط کا ذکر سنتے ہی وہ چونکی۔

''کیسی شرط۔'' اس نے پہلی بار زبان کھولتے ہوئے بے اختیار پوچھا۔

''میں بتا چکا ہوں کہ میرے دل میں کیپٹن فرخ کے لیے ہمدردی پیدا ہو چکی تھی۔'' فراز نے جواب دیا۔ ''وہ تمہارے والد کے بہترین دوست کا بیٹا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں درمیان میں نہ ہوتا تو شیرازی صاحب اسی کے حق میں فیصلہ کرتے۔ وہ اب بھی تم سے محبت کرتا ہے۔ اس لیے انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ میرے درمیان سے ہٹنے کے بعد تم پر اس کے علاوہ کسی اور کا حق فائق نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں صرف اسی صورت میں تمہیں طلاق دوں گا۔ جب تم فرخ سے شادی کا تحریری وعدہ کرو گی۔''

''لیکن میری شادی ڈاکٹر شہزاد سے ہو چکی ہے۔'' شہلا جیسے کراہتے ہوئے بولی۔

''وہ نکاح جائز نہیں حرام ہے۔'' فراز نے غصے سے کہا۔ ''کیونکہ میں تمہارا پہلا شوہر ابھی زندہ ہوں۔ تمہیں شہزاد سے طلاق یا خلع حاصل کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ تم براہ راست فرخ سے شادی کر سکتی ہو۔'' فراز ایک لمحے کے لیے رکا۔ اس سے پہلے کہ شہلا کچھ کہتی وہ بولا۔ ''مگر مجھے حیرت ہے کہ ابھی تک فرخ یہاں کیوں نہیں پہنچا۔ میری معلومات کے مطابق وہ قید ہو گیا تھا اور اب جنگی قیدیوں کی رہائی کے بعد اسے بھی پاکستان آ جانا چاہیے تھا۔ کیا وہ تم سے ملا تھا۔''

''ہاں۔'' شہلا نے مرجھائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ تین دن پہلے مجھ سے ملنے آیا تھا۔''

''کیا اس نے تمہیں بتایا کہ میں نے اسے وصیت کی تھی کہ اگر میں زندہ نہ بچ سکوں تو وہ تم سے شادی کر لے۔''

''وہ یہی کہہ رہا تھا لیکن اسے تمہارے زندہ ہونے کا پتا نہیں ہے۔''

''میں نے کسی کو بھی حد یہ کہ اپنے والدین کو بھی نہیں بتایا ہے کہ میں زندہ لوٹ آیا ہوں۔ وہ مجھے رو پیٹ کر صبر کر چکے ہیں میں ان کے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا۔'' فراز نے جواب دیا۔ ''تو پھر بولو...... کیا کہتی ہو۔''

''کیا تم دونوں مجھے میرے حال پر نہیں چھوڑ سکتے۔'' شہلا کی آنکھیں بھیگتی جا رہی تھیں۔

''تو پھر ٹھیک ہے کہ میں آج ہی اپنی واپسی کا اعلان کر کے فیملی کورٹ یا کسی بڑے مفتی سے فتویٰ حاصل کر لوں گا کہ ڈاکٹر شیراز سے تمہاری شادی ناجائز ہے۔''

”نہیں۔“ شہلا ایک دم چپ پڑ گئی۔

”نہیں کیوں۔ تم بہر حال مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ تمہارے خطوط اس کا ثبوت ہیں۔“

”مگر اب میں ان تمام پرانی یادوں کو فراموش کر چکی ہوں۔“

”مگر مجھے سب کچھ یاد ہے۔ میں تمہارے گھر پہنچ گیا تو شہزاد بھی مجھے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے سے نہیں روک سکتا۔“

”تمہیں مجھ پر رحم نہیں آتا۔“ وہ سسکتے ہوئے بولی۔

”آتا ہے اسی لیے چاہتا ہوں کہ تم فرخ سے شادی کر لو۔ دوسری صورت میں جو کچھ ہوگا۔ اس کی ذمہ دار تم خود ہوگی۔“

”میں، میں سوچ کر جواب دوں گی۔“ شہلا کو فوری طور پر بچ نکلنے کی اور کوئی صورت نہیں دکھائی دی۔

”تم نے فرخ کو کیا جواب دیا تھا۔“

”میں نے اس سے بھی سوچنے کی مہلت مانگی تھی۔“

”کتنے دن کی۔“

”ایک ہفتے کی۔“

”جس میں صرف تین دن باقی رہ گئے ہیں۔“ فراز نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں بھی تمہیں سوچنے کے لیے تین دن دیتا ہوں۔“

”تو اب میں جاؤں۔“ شہلا کرسی سے کھڑی ہوگئی۔

”اتنی جلدی بھی کیا۔ کچھ دیر تو اور بیٹھو چلی جانا۔“

”میں زیادہ وقت نہیں دے سکتی۔“ شہلا نے کچھ اضطراب کے ساتھ کہا۔ ”شہزاد کسی بھی وقت آ سکتے ہیں اور میں ملازمہ سے یہ کہہ کر آئی ہوں کہ میں اپنی ایک سہیلی سے ملنے جا رہی ہوں۔ ایک گھنٹے تک واپس آ جاؤں گی۔“

”اچھی بات ہے تمہیں بلاوجہ نہیں روکوں گا۔“ فراز نے جواب دیا۔ ”مگر خیال رکھنا تمہیں صرف تین دن کی مہلت حاصل ہے۔ جس میں تمہیں اپنی آئندہ زندگی اور اپنے مستقبل کی خوش حالی یا بربادی کا فیصلہ کرنا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر تمہارا فیصلہ میری اور فرخ کی خواہشات کے خلاف ہوا تو اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔“

☆☆

ڈاکٹر شہزاد نے اس روز بھی صبح تقریباً دس بج کر دس منٹ پر فون کیا اور نتیجے میں فون انگیج ملا۔ دوبارہ اسے فون کرنے کا موقع آدھے گھنٹے کے بعد ملا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آج شہلا کس سے بات کرنے کا بہانہ بناتی ہے۔ کسی نامعلوم وجہ سے اسے یہ یقین تھا کہ شہلا آج بھی اسی فرد سے بات کر رہی تھی۔ جس سے تین دن قبل ہم کلام تھی۔

لیکن جواب میں دوسری طرف سے شہلا کے بجائے ملازم کی آواز سن کر اسے حیرت ہوئی۔

”بیگم صاحبہ! کہاں ہیں۔“ اس نے پوچھا۔

”وہ اپنی سہیلی شائلہ نذیر کی طرف گئی ہوئی ہیں۔“ ملازمہ نے بتایا۔ ”بتا رہی تھیں کہ کوئی ضروری کام ہے۔ ایک گھنٹے میں واپس آ جائیں گی۔“

”کیا آدھا گھنٹہ پہلے شائلہ کا فون بھی آیا تھا۔“

”کوئی فون آیا تو تھا۔ شاید انہی کا ہو۔ بیگم صاحبہ اس فون کے بعد ہی گئی ہیں۔“

شہزاد نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ اپنے دل میں کچھ شرمندہ سا ہو رہا تھا۔ شائلہ اس کے دوست بیرسٹر نذیر کی بیوی تھی اور اس دوستی کی وجہ سے شہلا اور شائلہ میں بھی رسم و راہ بڑھی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ شائلہ عنقریب دوسرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ نذیر نے شائلہ کا رجسٹریشن اسی کے اسپتال میں کرایا تھا۔ چنانچہ شہزاد سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے شائلہ نے اس سلسلے میں شہلا کو فون کیا ہو۔ وہ بلاوجہ اس کی طرف سے بدگمان ہو رہا۔ رہی تین دن پہلے کے فون کی بات تو شہلا کی غلط بیانی کی کوئی بہت ہی سادہ بے ضرر سی وجہ ہو سکتی ہے جو ممکن ہے وہ کبھی خود ہی بتا دے۔

چنانچہ شام کو جب وہ گھر واپس گیا تو اس نے دانستہ اپنے فون کرنے کا کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ ہی یہ پوچھا کہ آج وہ شائلہ کے گھر گئی تھی تو وہاں سب خیریت تو ہے ناں۔ اس نے سوچا ممکن ہے ملازمہ نے اسے اس کے فون کے بارے میں بتا دیا ہو۔ اب وہ اس سلسلے میں بات کرے گا تو شہلا کو شکایت ہو سکتی ہے کہ وہ آج کل اس کے معمولات کو شک کی نظر سے کیوں دیکھ رہا ہے لیکن وہ یہ دیکھ کر فکر مند ہو گیا کہ شہلا پچھلے تین چار دن کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی فکر مند معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا بھی تو شہلا نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس کے سر میں دو تین دن سے درد رہنے لگا ہے جو آج کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا ہے اور یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔

وہ جن الجھنوں میں پھنس گئی تھی۔ وہ اس کے اعصاب و ذہن پر اتنا شدید دباؤ ڈال رہے تھے کہ درد سر میں مبتلا ہو جانا لازمی تھا۔ شہزاد نے کھانے کے بعد اسے ایک دوا دے کر معمول سے پہلے آرام کرنے بھیج دیا۔

شہزاد نے دوسرے فون کا مسئلہ ذہن سے تقریباً نکال ہی دیا تھا۔ مگر یہ اتفاقات بھی عجیب ہوتے ہیں کبھی جو باتیں چھپائی جا رہی ہوتی ہیں انہیں ظاہر کر دیتے ہیں اور کبھی ظاہر ہونے والی باتوں کو حیرت انگیز طور پر پوشیدہ کر دیتے ہیں۔ اب یہ محض اتفاق ہی تھا کہ دوسرے دن ماہانہ چیک اپ کے سلسلے میں شائلہ کو اسپتال آنا پڑا۔ وہ آئی چیک اپ کرایا۔ چیک اپ لیڈی ڈاکٹر کرتی تھی۔ اس لیے شہزاد کو پتہ بھی نہ چلتا کہ وہ آئی تھی یا نہیں لیکن شائلہ خود ہی اس کے کمرے میں شکایت لے کر پہنچ گئی۔

”یہ آپ نے شہلا بھابی کو گھر میں کھونٹے سے کیوں باندھ کر رکھا ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”میں نے باندھ رکھا ہے!“ شہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا وہ یہی سمجھا کہ کل دونوں کی ملاقات ہوئی تھی تو شہلا نے ضرور کوئی گلہ کیا ہوگا۔

”لگتا تو ایسا ہی ہے کہ تقریباً دو ہفتے ہو گئے اور انہیں ایک بار بھی ہمارے یہاں آنے کا وقت نہیں ملا۔“

شہزاد کہتے کہتے رک گیا کہ وہ کل تو گئی تھیں۔ اسے فوراً احساس ہوا کہ شہلا نے ملازمہ سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ شائلہ سے ملنے کا بہانہ کر کے کہیں اور گئی تھی۔ شاید اس سے ملنے جو اسے فون کر رہا تھا۔ مگر بظاہر اس نے بات ٹال دی۔

”میرے خیال سے شہلا کو کہیں اکیلے آنے جانے کی عادت نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں ادھر کچھ دیر مصروف ہو گیا ہوں۔ اس لیے نہ میں انہیں کہیں لے کر جا سکا اور نہ وہ کہیں گئی تھیں۔ تعجب ہوگا۔ مگر سچ یہ ہے کہ اس مصروفیت کے باعث ہم لوگ ایک ماہ سے امی ابو سے ملنے بھی نہیں جا سکے ہیں۔“

”اچھا تو آئندہ اتوار ضرور آیئے۔“

”بھئی آئندہ اتوار کو تو مشکل ہے۔ اس دن کے لیے ہم نے پروگرام بنا لیا ہے۔ البتہ اس سے اگلے اتوار کو ضرور آئیں گے۔“ شہزاد نے کہا۔

شائلہ چلی گئی لیکن شہزاد کو ایک بڑی الجھن میں ڈال گئی اسے کچھ غصہ آنے لگا کہ شہلا اس سے برابر جھوٹ بول رہی تھی اور اسی غصے میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آج شام کو شہلا سے ضرور پوچھے گا کہ آخر وہ پراسرار فون کرنے والا کون ہے۔ جسے چھپانے کی خاطر شہلا مسلسل جھوٹ بول رہی ہے لیکن جب شام کو وہ اسپتال سے گھر

پہنچا تو شہلا تیز بخار میں مبتلا تھی۔ شہزاد کا غصہ دودھ کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ سب کچھ بھول کر اس کے علاج اور تیمار داری میں لگ گیا۔

دوسرے دن صبح اسپتال روانگی کے وقت تک شہلا کی طبیعت زیادہ بہتر نہیں تھی۔ بخار ضرور اتر گیا تھا۔ مگر وہ بے حد کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ شہزاد کو اپنی رائے میں تھوڑی سی تبدیلی کرنا پڑی۔ اگر وہ مسئلہ اتنی رنگین نوعیت کا ہے کہ شہلا کو بیمار ڈال سکتا ہے۔ تو پھر یقیناً اس کے جھوٹ بولنے میں بھی ارادہ نہیں انتہائی مجبوری شامل ہو گی۔ کوئی ایسی مجبوری کہ زبان کھولنے کی صورت میں اسے خطرناک نتائج کی دھمکی دی گئی ہو۔ چنانچہ شہزاد نے اسے طاقت کا ایک انجکشن دیا اور آرام کرنے کی تاکید کرتے ہوئے اسپتال چلا گیا۔

دوپہر ایک بجے کے قریب اسے کچھ فرصت ملی تو اس نے گھر فون کر کے شہلا کی خیریت معلوم کرنے کا ارادہ کیا۔ یوں وہ ایک فون ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ کر چکا تھا۔ جس کے جواب میں ملازمہ نے بتایا تھا کہ بیگم صاحبہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔ ابھی اس نے ریسیور کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک نرس ایک ملاقاتی کا کارڈ دیا۔ ڈاکٹر شہزاد نے کارڈ پڑھا۔ جس پر آرمی انٹیلی جنس میجر ضمیر بیگ کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس نے نرس سے کہا کہ میجر صاحب کو اندر بھیج دو۔ چند لمحے بعد ایک ادھیڑ عمر صحت مند جسم کا آدمی جس نے یونیفارم کے بجائے سادہ لباس پہن رکھا تھا اندر داخل ہوا شہزاد نے کرسی سے اٹھ کر ہاتھ ملایا اور بالمقابل کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''فرمایئے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔'' اس نے پوچھا۔

''مجھے قومی سلامتی اور فوجی اہمیت کے ایک کیس میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔'' میجر ضمیر بیگ نے نرم لہجے میں بتایا۔

''میں ہر ممکن تعاون کے لیے حاضر ہوں۔''

''پہلے یہ بتایئے کہ آپ نے میجر فراز علی کا نام سنا ہے۔''

''جی ہاں۔''

''کچھ ان کے حالات سے واقف ہیں۔''

''کسی حد تک مثلاً مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ جنگ کے دوران جیسور کے محاذ پر دشمن سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔''

''اچھا آپ کسی کیپٹن فرخ سے بھی واقف ہیں۔''

''جی نہیں یہ نام میرے لیے بالکل نیا ہے۔''

''مگر ہماری اطلاع کے مطابق وہ چھ دن پہلے آپ کے گھر آیا تھا۔''

''کس وقت۔''

''صبح تقریباً ساڑھے دس بجے۔''

''میں اس وقت اسپتال میں ہوتا ہوں۔ اس لیے میری عدم موجودگی میں کون آیا' کون گیا۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''آپ نے کہا کہ آپ اسے نہیں جانتے۔'' میجر ضمیر بیگ نے پوچھا۔ ''پھر کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کی بیگم اسے جانتی ہوں۔''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' شہزاد نے جواب دیا۔ ''لیکن میجر صاحب کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ آپ پہلے تھوڑی بہت اس معاملے کی وضاحت کریں کہ آپ میجر فراز یا کیپٹن فرخ سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔ پھر ممکن ہے میں زیادہ کام آ سکوں۔''

''میجر فراز کے بارے میں ہماری پہلی اطلاع یہ تھی کہ وہ دشمن سے دلیرانہ جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔'' میجر ضمیر بیگ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن بعد میں اس کی رجمنٹ نے کچھ دوسرے افراد کی زبانی [illegible] جو اطلاعات ملی ہیں ان سے شبہ ہوتا ہے کہ ان کی موت میں دشمن کا ہاتھ نہیں جتنا ایک اپنے کا تھا۔ کیپٹن فرخ بھی اس محاذ پر ان کے ساتھ تھا اور بظاہر دونوں میں بڑی دوستی تھی لیکن دشمن کے آخری حملے کے دوران ہمارے ایک لیفٹیننٹ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جس وقت انتہائی شدید جنگ ہو رہی تھی۔ دونوں طرف سے گولیاں اور توپ کے گولے برس رہے تھے۔ کیپٹن فرخ نے دانستہ میجر فراز پر گولیاں چلائیں۔

جس وقت وہ گولیاں کھا کر گرے ٹھیک اسی لمحے دشمن کی کسی توپ کا ایک گولہ ان کے قریب آ کر پھٹا اس کے بعد سے میجر فراز کا کوئی پتہ نہیں چلا اسی لیفٹیننٹ کا بیان ہے کہ گولے کی زد میں آ کر میجر فراز کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

اگرچہ ہمیں ان کی لاش نہیں ملی اور نہ ہی کوئی ایسا حصہ جسم ملا یا کوئی اور ثبوت جس سے یقینی طور پر ان کی شہادت کی تصدیق ہو جاتی لیکن دوسرے شواہد کے پیش نظر لیفٹیننٹ کا بیان درست معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال اس کے بعد جنگ ختم ہو گئی۔ ہمارے فوجی قیدی بنا لیے گئے۔ قیدیوں کے کیمپ میں رہنے کے دوران بھی ہمیں کچھ ثبوت اور کچھ بیانات ایسے ملے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیپٹن فرخ نے جو دوسرے فوجیوں کے ساتھ گرفتار ہو گیا تھا درپردہ اپنے آپ کو دشمن کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے اور پاکستان واپس پہنچ کر اس کے لیے جاسوسی کرنا اور فوجی اہمیت کے راز اس تک پہنچانے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ ہمارے پاس اس خیال کی تصدیق کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔

لیکن پھر بھی جب فوجی قیدی واپس آئے تو کیپٹن فرخ کو پنشن کے ساتھ ریٹائر کر دیا گیا۔ مگر ہم مسلسل اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہے ہیں کہ اس پر جاسوسی اور غداری کا الزام ثابت ہو جائے یا پھر میجر فراز کی موت سے ہی اس کا براہ راست [illegible] سامنے آ جائے۔ تو اسے کرار واقعی سزا دلا سکیں۔ ہماری نگرانی کرنے والوں نے اسے آپ کے گھر جاتے دیکھا۔ چنانچہ ہمیں یہ جاننے سے بے حد دلچسپی ہے کہ وہ آپ کے گھر کیوں گیا تھا۔''

ڈاکٹر شہزاد نے کچھ دیر تک خاموشی کے ساتھ میجر ضمیر بیگ کی بتائی ہوئی باتوں پر غور کیا۔ یہ قطعی ممکن تھا کہ پچھلے کئی دن سے جو مسئلہ اسے پیش آ رہا تھا۔ اس کا تعلق کیپٹن فرخ سے ہو۔ اس نے شہلا کو فون کیا ہو۔ وہی اس سے ملنے آیا ہو اور پھر شہلا' شائلہ کے یہاں جانے کا بہانہ کر کے اس سے ملنے گئی ہو۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرخ' شہلا سے ملنے کیوں آیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کیا تعلق تھا کہ شہلا اس کے فون یا اس کی آمد چھپانے کے لیے جھوٹ بولنے پر مجبور تھی۔

''میجر صاحب آپ کی آمد سے قبل ایک مسئلہ میرے ذہن کو بھی پریشان کر رہا تھا۔'' آخر اس نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق ہو۔ پوری تفصیل تو مجھے معلوم نہیں لیکن جو کچھ بھی میں جانتا ہوں وہ مختصر طور پر کچھ یوں ہے۔'' اور اس نے میجر ضمیر کے سامنے گزشتہ چھ دن کے خیالات بیان کر دیے۔ میجر ضمیر نے گہری دلچسپی سے تمام باتیں سنیں اور شہزاد کی گفتگو کے دوران بھی اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں غور کرتا رہا۔

''آپ ان حالات سے کیا نتیجہ نکالیں گے۔'' شہزاد نے اپنی بات ختم کر کے پوچھا۔

''میرا خیال ہے۔ آپ کی بیگم فرخ کو جانتی ہیں۔'' ضمیر بیگ نے محتاط الفاظ میں کہا۔ ''میرا مطلب ہے آپ سے شادی کرنے سے بھی بہت پہلے سے اور اس واقفیت میں برا نہ مانیے گا۔ یہ محض اندازہ ہے۔ کوئی ایسی بات بھی تھی جس کی دھمکی دے کر غالباً فرخ آپ کی بیگم کو بلیک میل کر رہا ہے۔ کیا ان دنوں آپ کی وائف نے آپ

سے کسی بڑی رقم کا مطالبہ تو نہیں کیا۔“

”جی نہیں...... ویسے خود ان کا اپنا اکاؤنٹ بھی ہے۔ جس میں کافی بیلنس موجود ہے۔“ شہزاد نے جواب دیا۔

”تب ممکن ہے انہوں نے اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکالی ہو۔“

”میرا یہ خیال نہیں ہے۔“ شہزاد نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”کیونکہ ان کی چیک بک الماری کی جس دراز میں رکھی ہے وہ اس کی چابی گم کر کے بیٹھی ہیں۔ مجھ سے دوسری چابی بنوانے کے لیے کہا تھا۔ مگر میرے ذہن سے یہ بات بالکل ہی نکل گئی۔ اس وقت اکاؤنٹ کے ذکر پر یاد آئی ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے طور پر چابی بنوالی ہو۔“

”ہو تو سکتا ہے۔ مگر مجھے اس پر شبہ ہے۔ وہ اس طرح کے کاموں سے بہت الجھتی ہیں۔“

”تب پھر ممکن ہے فرخ رقم کے بجائے بلیک میلنگ کے سلسلے میں کوئی اور مطالبہ کر رہا ہو۔“ میجر ضمیر بیگ نے سوچتے ہوئے کہا۔

”اگر ہم آپ کی وائف اور فرخ کی واقفیت کا پہلے سے ہونا تسلیم کر لیں تو ایسا مطالبہ ہو تو سکتا ہے۔“

”میں آپ کی سوچ کا رخ سمجھ رہا ہوں۔“ شہزاد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مگر مجھے مکمل یقین ہے کہ شہلا کی سابقہ زندگی میں ایسی واقفیت نہیں ہو سکتی کہ کوئی اس کی بنیاد پر اسے بلیک میل کر سکے۔“

”آپ تعاون کریں تو ہماری اور آپ کی دونوں کی الجھن آسانی سے حل ہو سکتی ہے۔“ میجر ضمیر نے کہا۔

”وہ کس طرح۔“ شہزاد نے دلچسپی سے پوچھا۔

”آپ کا ٹیلیفون ٹیپ کر کے تاکہ اس پر ہونے والی ہر گفتگو ہم سن بھی سکیں اور ریکارڈ بھی کر سکیں۔“ میجر ضمیر نے جواب دیا۔ ”اور اس کے علاوہ آپ کی بیگم کی نقل و حرکت کی نگرانی کر سکے۔“

”نگرانی پر مجھے یاد آیا۔“ شہزاد نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”کہ آپ کے آدمی اگر فرخ کی نگرانی کر رہے ہیں تو کیا انہیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔“

”ہمیں معلوم ہے۔ وہ گارنیئر ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔“

”کس کمرے میں۔“

”یہ ہم نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ ہم اسے ہوشیار کرنا نہیں چاہتے۔“

”اچھا اور وہ جاتا کہاں کہاں ہے۔“

”یہ ایک اور الجھی ہوئی صورت حال ہے۔“ میجر ضمیر نے جواب دیا۔ ”اب تک ہمیں جو رپورٹیں ملی ہیں ان کے مطابق وہ دو مرتبہ سٹار ہوٹل گیا ہے اور ایک مرتبہ آپ کے گھر۔ اس کے علاوہ اس کا بیشتر وقت گارنیئر ہوٹل میں گزرتا ہے یا شام اور رات کو یونہی بے مقصد سیر و تفریح میں۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ دشمن کے کسی ایسے ایجنٹ یا اس کے سفارتخانے سے رابطہ قائم کیے ہوئے ہے مگر اس نے گارنیئر سے کسی کو فون تک نہیں کیا اور نہ کسی نے اسے کال کیا۔ اس نے جو بھی دو چار فون کیے وہ ہوٹل سے باہر پبلک کال بوتھ سے کیے ہیں۔“

”وہ اسٹار ہوٹل میں کیوں گیا تھا۔“ شہزاد نے سوال کیا۔

”ہمارا جو کارکن اس کا تعاقب کر رہا تھا اس کی رپورٹ ہے کہ وہ ہوٹل میں داخل ہوا اور استقبالیہ کاؤنٹر پر رکے بغیر آگے بڑھ کر دائیں جانب گھوم گیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ہوٹل سے باہر نکلا اور ایک ٹیکسی پکڑ کر گارنیئر ہوٹل چلا گیا۔ گمان غالب ہے کہ وہ وہاں کسی سے ملنے گیا تھا۔ مگر کسی سے ملنے گیا تھا۔ یہ پتہ نہیں چل سکا۔“

”آپ نے معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔“

”کی تھی۔ مگر استقبالیہ کلرک اس کی تصویر شناخت نہیں کر سکا۔“ میجر ضمیر نے جواب دیا۔ ”اس کا کہنا تھا کہ جو لوگ ہوٹل میں قیام پذیر ہوتے ہیں اگر کوئی ان سے ملنے آئے اور کاؤنٹر پر ان کے بارے میں پوچھے تب تو یہ بتانا ممکن ہے کہ کون کس سے ملنے گیا لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملاقات کرنے والوں کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے۔ جس سے انہیں ملنا ہوتا ہے کہ وہ کس کمرے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تمام افراد کے چہرے بھی یاد رکھنا مشکل ہے اور جو لوگ اس سے ملنے آتے ہیں ان کے بارے میں کچھ کہنا تو اور بھی مشکل ہے اس لیے وہ کچھ نہیں بتا سکتا کہ یہ شخص ہوٹل میں آیا تھا یا نہیں اور آیا تھا تو کس سے ملنے آیا تھا۔ ایسے اگر اسٹار ہوٹل میں اس کی آمد و رفت زیادہ ہوتی تو ہم ضرور اس کے ملاقاتی کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔“

”پھر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔“ شہزاد نے پوچھا۔

”آج رات گیارہ بجے کے بعد ہمارا ایک ٹیکنیکل آدمی آپ کے گھر آئے گا۔“ میجر ضمیر نے جواب دیا۔ ”اور وہ آپ کے ٹیلیفون سیٹ کے ساتھ کچھ ایسے آلات کا کنکشن کر دے گا جو دوسرے کمرے میں کہیں پوشیدہ رکھے ہوں گے۔ اس طرح آپ کے فون پر ہونے والی ہر گفتگو ریکارڈ ہوتی رہے گی۔ اس کے علاوہ وہ ایسا انتظام بھی کر دے گا کہ ہم اس گفتگو کو اپنے وائرلیس ٹیلیفون پر ہونے والی ہر گفتگو آسانی سے سن سکیں گے۔“

”مگر یہاں ہمیں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ اب وہاں گھر میں کوئی کال آئی ہے۔“

”جیسے ہی کوئی کال آئے گی تو جب آپ کے گھر فون کی ... ہمارے وائرلیس فون کی گھنٹی بھی بجنے لگے گی۔“

”خدا کرے آپ کی یہ کوشش کامیاب ثابت ہو...... اور آپ کے ساتھ مجھے بھی میری پریشانی کا حل مل جائے۔“ شہزاد نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

اگلے دن کے لیے شہزاد نے اپنی جگہ رات کی ڈیوٹی پر آنے والے ڈاکٹر کو اضافی وقت دینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ اس لیے وہ خود بھی میجر ضمیر کے ساتھ اسپتال کے ایک عقبی کمرے میں موجود تھا۔ جسے اس ضروری کام کے لیے خالی کرایا گیا تھا۔ ہر چند میجر ضمیر نے اسے سمجھایا کہ یہ کام بڑا صبر آزما بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ جس خاص فون کا ہمیں انتظار ہے وہ آج ہی آ جائے وہ کل بھی آ سکتا ہے۔ اس کے لیے کسی دن کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ جب ایسی کوئی کال آئے گی تو شہزاد کو اطلاع کر دی جائے گی۔ مگر شہزاد نے جواب دیا کہ اس کا دل کہہ رہا ہے کہ وہ فون آج ہی آئے گا۔ اس لیے وہ کم سے کم آج کے دن تو ضمیر کے ساتھ انتظار کرے گا ہی اگر بدقسمتی سے یہ انتظار لاحاصل ثابت ہوا۔ تب وہ اس کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کرے گا ظاہر ہے کہ ان دونوں کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ فرخ نے اور فراز نے جو مہلت شہلا کو دی تھی اس کی موت آج ختم ہو رہی ہے اس لیے کسی نہ کسی کو تو آج آنا ہی تھا۔ فرخ فون بھی کر سکتا تھا اور خود بھی آ سکتا تھا لیکن فراز کی جانب سے تو فون کال ہی آ سکتی تھی۔

شہزاد کے خیال سے میجر ضمیر بیگ دو وائرلیس فون لے آیا تھا۔ ان دونوں کی سیٹنگ اس نمبر کے ساتھ کی گئی تھی جو شہزاد کے گھر کا نمبر تھا۔ ٹھیک دس بج کر بیس منٹ پر دونوں فون کی باریک آواز والی گھنٹی بجنے لگی۔ شہزاد اور ضمیر نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک شہلا نے ریسیور

نہیں اٹھالیا جیسے ہی گھنٹی بجنا بند ہوئی دونوں نے بڑی آہستگی سے ریسیور اٹھالیا اور اپنے کان سے لگا لیے۔

”ہیلو..... شہلا۔“ لہجہ اور انداز بتا رہا تھا کہ وہ فراز ہے۔ ”آج ساتواں دن ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ شہلا نے کمزور آواز میں جواب دیا۔

”کیا فرخ آیا تھا یا اس نے فون کیا تھا۔“

”نہیں۔“ شہلا نے مختصر جواب دیا۔

”میرا بھی یہ ہی خیال تھا۔“ فراز بولا۔ ”ممکن ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ فون کرے یا خود آجائے۔ مگر میں نے سوچا کہ اس سے پہلے میں تم سے بات کرلوں۔ پھر کیا فیصلہ کیا تم.....“

”آپ..... آپ مجھے کچھ اور وقت نہیں دے سکتے۔“

”بالکل نہیں۔ میرے تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں اور میں آج جا رہا ہوں۔“ فراز نے سخت لہجے میں [illegible] سوچ رہی ہو۔ وہ تمہاری [illegible] فیصلہ سن لو۔ اگر تم ایک گھنٹے کے اندر یہاں میرے پاس نہیں پہنچیں تو میں اپنی موجودگی کا اعلان کردوں گا۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم اور مفتی سے یہ فتویٰ پہلے ہی حاصل کرلیا ہے کہ تمہاری دوسری شادی ناجائز اور حرام ہے۔ اس کے بعد تمہارا جو کچھ حشر ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں لیکن اس تمام ذلت و رسوائی کے ذمے دار صرف تم ہوگی۔ میں نے اور فرخ نے تو تمہیں بدنامی سے بچانے کے لیے اپنی سی پوری کوشش کی آگے تمہاری مرضی۔“

شہزاد اور میجر ضمیر نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ صورت حال ان کے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ ہر چند انہوں نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ پھر بھی اس وقت بولنا خطرناک ہوسکتا تھا۔

”نہیں خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔“ شہلا بھرائی آواز میں بولی۔ ”میں آ رہی ہوں لیکن اس دوران میری عدم موجودگی میں اگر فرخ آ گیا یا اس نے فون کیا اور اسے کوئی جواب نہ ملا تو وہ تو اپنی دھمکی پر عمل کر بیٹھے گا۔“

”گھبراؤ نہیں۔ اول تو وہ اتنا عجلت پسند نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ یہاں تمہیں زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگیں گے۔ میں نے طلاق نامہ بھی ٹائپ کرلیا ہے اور وہ کاغذ بھی جس پر تمہیں دستخط کرنا ہیں۔ تم اپنے کاغذ پر دستخط کرنا اور میں طلاق نامے پر ظاہر ہے ہمارے درمیان کوئی مزید گفتگو نہیں ہونا ہے۔ تم طلاق نامہ لے کر واپس چلی جانا۔“

”اور..... اور وہ کاغذ جس پر دستخط کروں گی۔“

”وہ میں فرخ کو دے دوں گا' ظاہر ہے اس کا تعلق اسی سے ہوگا۔“

”فرخ کو معلوم ہے کہ آپ زندہ ہیں۔“

”ابھی تک تو وہ بھی لاعلم ہے۔“

”آپ وہ کاغذ مجھے نہیں دے سکتے۔“

”تاکہ تم اسے پھاڑ کر پھینک دو۔“

”نہیں جب تک فرخ کے پاس وہ خطوط اور فوٹو ہیں میں اسے کیسے پھاڑ سکتی ہوں۔“

”پھر تم اس کا کیا کروگی۔“

”میں اپنا جواب یا وہ کاغذ فرخ کو اس وقت تک نہیں دینا چاہتی جب تک وہ خطوط اور فوٹو واپس نہ کردے۔“

”اس بارے میں تم اطمینان رکھو۔ تمہاری امانت تمہیں مل جائے گی۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ اس کے علاوہ وہ چیزیں اس کے لیے اسی وقت کارآمد ہیں جب تک تم اس کی بات نہیں مان لیتیں۔ بہرحال باتوں میں وقت ضائع مت کرو میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ اسٹار ہوٹل کمرہ نمبر چھبیس' پتہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی ریسیور رکھے جانے کی آواز کے ساتھ رابطہ منقطع ہوگیا۔

”یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔“ شہزاد الجھ کر بولا۔ ”اس کی باتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ میجر فراز ہے۔“

”ناممکن ہے۔“ میجر ضمیر نے پرزور لہجے میں کہا۔ ”ہمارے پاس عینی گواہوں کے بیانات موجود ہیں جنہوں نے میجر سے ایک فٹ کے فاصلے پر توپ کا گولہ پھٹتے دیکھا۔ ایسی صورت میں کسی کا بچ نکلنا ناممکنات میں سے ہے یہ کوئی فراڈ ہے اور اس کا اسٹار ہوٹل میں موجود ہونا ثابت کرتا ہے کہ اس کی فرخ کے ساتھ سازباز ہے۔ فرخ یقیناً اسی سے ملنے اسٹار ہوٹل گیا ہو گا۔“

”لیکن وہ ایسی کیا سازش کر رہے ہیں جس کا تعلق شہلا سے ہے۔“ شہزاد نے کہا۔ ”وہ خطوط اور فوٹو کیسے ہیں جو فرخ کے پاس ہیں۔ یہ لوگ شہلا سے کیسا کاغذ لکھوانا چاہتے ہیں۔“

”ان تمام سوالات کا جواب ابھی کچھ ہی دیر میں مل جائے گا۔“ میجر ضمیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ہم اسے ہوٹل سے بھاگنے نہیں دیں گے۔ اس سے پہلے کہ آپ کی وائف وہاں پہنچیں ہوٹل کا محاصرہ کرلیا جائے گا۔ ہم تب تک انتظار کریں گے جب تک وہ اس سے مل کر کمرے سے باہر نہ آجائیں۔ فرخ تو اسے ہم جس وقت چاہیں گرفتار کرسکتے ہیں۔“

میجر ضمیر بیگ نے اس وائرلیس ٹیلیفون پر کوئی نمبر ڈائل کرکے تیزی سے بولتے ہوئے ضروری ہدایات دیں وہ کمرے سے باہر جانے لگا تو شہزاد نے جلدی سے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں بھی آپ کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔“

”اوکے..... مگر آپ ہمارے کسی کام میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔“ میجر ضمیر بیگ نے جواب دیا۔

شہلا گیارہ بج کر بیس منٹ پر ایک ٹیکسی سے ہوٹل اسٹار کے سامنے اتری اور بغیر ادھر ادھر دیکھے ہوٹل میں داخل ہوگئی لیکن اگر دیکھتی بھی تو اسے کسی غیر معمولی صورت حال کا اندازہ نہ ہوتا۔ میجر ضمیر کے تربیت یافتہ چاق و چوبند تو جوان اس طرح ہوٹل کے اردگرد موجود تھے کہ کوئی بھی انہیں شناخت نہیں کرسکتا تھا۔ شہلا دوسری منزل پر پہنچی ایک مناسب آڑ میں کھڑے میجر ضمیر اور شہزاد نے اسے کمرہ نمبر ۲۲۶ میں داخل ہوتے دیکھا۔ ہوٹل کی انتظامیہ کے تعاون سے کمرہ نمبر ۲۲۵ جو اتفاق سے خالی تھا۔ حاصل کیا جاچکا تھا اور اس میں چار مسلح جوان میجر ضمیر کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد شہلا اپنا ہینڈ بیگ بند کرتے ہوئے باہر نکلی اور جس طرح آئی تھی۔ اسی طرح گردوپیش سے بے خبر اپنی سوچوں میں گم زینہ اترتی چلی گئی۔ اسے جانے دیا گیا لیکن جیسے ہی وہ سیڑھیوں پر نظروں سے اوجھل ہوئی میجر ضمیر اور اس کے مسلح جوان کمرہ نمبر دوسو چھبیس میں گھس گئے۔ میجر کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ کمرے میں موجود شخص اپنے سر سے غلاف نما نقاب اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر چونکا۔ فوجی جوانوں کو دیکھ کر اس پر کیا ردعمل ہوا یہ بتانا مشکل تھا لیکن وہ کرسی سے کھڑا ہوگیا۔

”کون ہو تم۔“ میجر ضمیر نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”میجر فراز علی۔“ اس کے لب و لہجے سے کسی گھبراہٹ کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

”بکواس کر رہے ہو میجر فراز تو جیسور کے محاذ پر شہید ہوچکے ہیں۔“

”بلاشبہ جس طرح توپ کا گولہ مجھ سے ایک فٹ کے فاصلے پر پھٹا تھا اس حساب سے مجھے مر ہی جانا چاہیے تھا لیکن خدا نے مجھے بچالیا البتہ میرا چہرہ اتنی بری طرح زخمی ہوا کہ اپنی خوفناک صورت چھپانے کے لیے مجھے یہ نقاب اوڑھنا پڑتا ہے۔“

''مگر گولہ پھٹنے سے پہلے کیپٹن فرخ کی چار گولیاں میجر فراز کے جسم میں پیوست ہو چکی تھیں۔ ہمارے پاس اس حقیقت کا عینی گواہ موجود ہے۔''

''آپ کے گواہ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کیپٹن فرخ میرا دوست تھا۔ وہ مجھ پر گولی کیوں چلاتا۔''

''اپنا نقاب اتار دو۔'' میجر ضمیر نے حکم دیا۔

''آپ میری خوفناک صورت برداشت نہیں کر سکیں گے۔''

''ہمیں فوج میں بہت کچھ برداشت کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ میجر ضمیر نے جواب دیا۔ ''اور اگر تم فوجی ہوتے تو تمہاری زبان سے یہ الفاظ نہ نکلتے۔''

فراز نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے اپنے سر سے غلاف نما نقاب اتار دیا اور بلاشبہ نقاب کے اندر سے بغیر بالوں کے سر کے ساتھ جو کریہہ المنظر چہرہ نمودار ہوا اسے دیکھ کر ڈاکٹر شہزاد نے ایک پل کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

''اب تو یقین آ گیا۔''

''نہیں یقین تک ابھی کئی مراحل باقی ہیں۔'' میجر ضمیر نے کہا اور اپنے نوجوانوں کو اشارہ کیا۔

دوسرے لمحے فراز ان جوانوں کی گرفت میں اتنا بے بس ہو چکا تھا کہ اپنی مرضی سے ذرا سی بھی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

''سچ کا اعتراف کرتے ہو یا میں اپنا کام شروع کروں۔'' میجر ضمیر نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جو سچ تھا میں بتا چکا لیکن تم میرے ساتھ کوئی سختی نہیں کر سکتے۔ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ اس کا انجام تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔'' فراز نے جواب دیا۔

''پہلے تم اپنے انجام کی فکر کرو۔'' میجر ضمیر نے جواب دیا۔

وہ آگے بڑھتے بڑھتے تقریباً ایک فاصلے پر رک گیا۔ فراز کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ گردن پر نظریں جمائیں اور اسی طرح دیکھتے دیکھتے اس کے پیچھے پہنچ گیا۔ اچانک اس کی آنکھوں میں کامیابی کی چمک نمایاں ہوئی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ سیدھے ہاتھ کی چٹکی سے گردن پر کوئی چیز پکڑی اور ایک جھٹکا دیا۔ ڈاکٹر شہزاد کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے فراز کے چہرے کی کھال الگ ہوتی چلی گئی ہو۔

دوسرے اور تیسرے جھٹکے کے بعد پورے سر اور چہرے پر منڈھی ہوئی ربر کی نقاب میجر ضمیر کے ہاتھ میں آ گئی اور پھر جو وہ گھوم کر سامنے آیا تو اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ تبسم نمودار ہوا۔

اور بلاشبہ وہ فرخ ہی تھا جو اب پہلی مرتبہ خوفزدہ اور گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے میجر ضمیر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش کھڑا اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہا۔ میجر ضمیر کے اشارے پر فوجی جوانوں نے اسے چھوڑ دیا۔ مگر اس طرح پوزیشن لے کر کھڑے ہو گئے کہ وہ بھاگنے کی کوشش کرتے تو کامیاب نہ ہو سکے۔

''کیسا کھیل میجر صاحب۔'' شہزاد نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ آپ کا بہت پرائیویٹ معاملہ ہے۔ ڈاکٹر شہزاد! میں نے ابھی دانستہ طور پر اس پہلو پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ برا نہ مانیے گا مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کی وائف آپ سے شادی سے پہلے مسز شہلا فراز رہ چکی تھیں۔ جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے میجر فراز کو شادی کے تیسرے دن ہی محاذ پر جانا پڑا۔ میرا اندازہ ہے کہ فرخ کسی نہ کسی صورت میں شہلا سے واقف تھا۔ یعنی میجر فراز سے ان کی شادی ہونے سے قبل ممکن ہے اس نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش بھی کی ہو لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی پھر اتفاق کے تحت محاذ جنگ پر میجر فراز سے اس کی ملاقات ہوئی اور اسے پتا چلا کہ جس شخص نے اسے شکست دی ہے۔ وہ فراز تھا۔

یہ بظاہر میجر کا دوست بن گیا۔ شہلا بڑی پابندی سے خطوط اور کچھ فوٹو جو شادی کے دوران لیے گئے تھے۔ اپنے شوہر کو بھیج رہی تھی۔ یہ خط اور فوٹو فرخ کی آگ پر تیل کا کام کر رہے تھے۔ اس نے موقع پا کر میجر فراز کو قتل کر دیا اور اس کی خوش قسمتی کہیے کہ اسی وقت ایک توپ کے گولے نے اس کے جرم کے تمام ثبوت غائب کر دیے لیکن اس نے وہ خطوط اور فوٹو اپنے قبضے میں کر لیے تھے۔ جنگی قیدیوں کے کیمپ میں اس نے اپنے آپ کو دشمن کے ہاتھ فروخت کرنے کی بھی کوشش کی مگر اب ہمیں اس پہلو کی پرواہ نہیں۔ اسے کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے یہ جرم ہی کافی ہے۔

بہر حال اسے بھی رہائی ملی لیکن اس کی مشتبہ حرکات کی وجہ سے اسے فوج سے نکال دیا گیا۔ یہ آپ کی وائف سے ملا پہلے فرخ کی صورت میں اور ان خطوط اور فوٹو کی بنیاد پر بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ غالباً اس نے یہ ہی سوچا ہوگا کہ آپ کو چھوڑ کر اس سے شادی کر لیں۔ دوسری طرف اس نے میجر فراز کا سوانگ رچا کر ان کی حیثیت میں سٹار ہوٹل کا کمرہ نمبر ۲۲۶ کرائے پر لے لیا میجر فراز کی آواز کی کامیابی سے نقل اتارتے ہوئے اس نے آپ کی وائف کو فون کیا ظاہر تھا کہ اگر میجر فراز زندہ ہے تو شہلا کی کسی اور سے شادی ناجائز اور حرام ٹھہرتی ہے۔ فراز کے کردار میں اس نے آپ کی وائف کو پیشکش کی کہ وہ طلاق دے دے گا۔ بشرطیکہ طلاق کے بعد وہ فرخ سے شادی کر لے۔''

میجر ضمیر ابھی یہیں تک کہہ پایا تھا کہ فرخ تیزی سے گھوما اور اس سے پہلے کہ کوئی اس کے ارادے سے واقف ہو سکے وہ ہوٹل کی کھڑکی پر چڑھ کر دوسری منزل سے نیچے کود گیا۔

میجر ضمیر اور شہزاد نے جلدی سے آگے بڑھ کر کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ فرخ سائڈ اسٹریٹ کی فٹ پاتھ پر بے حس و حرکت پڑا تھا اور فوج کے جوان جو ہوٹل کے عقبی حصے میں موجود تھے۔ اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ضمیر بیگ، شہزاد اور تمام فوجی جوان تیزی سے کمرے سے نکلے اور تقریباً بھاگتے ہوئے دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ اترتے ہوئے ہوٹل سے باہر آئے پھر عقبی گلی میں پہنچے پہلے شہزاد نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے فرخ کو دیکھا۔

وہ اپنی بدقسمتی سے سر کے بل گرا تھا اور چوٹ اتنی شدید تھی کہ سر کی ہڈی کئی جگہ سے ٹوٹ کر دماغ میں گھس گئی تھی۔ دوسری دوسری کئی ہڈیاں بھی ٹوٹی تھیں مگر وہ اتنی خطرناک نہیں تھیں۔ شہزاد نے گہری توجہ سے معائنہ کیا اور ضمیر کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اگر اسے پندرہ بیس منٹ کے اندر اسپتال نہیں پہنچایا جا سکا تو یہ مر جائے گا۔''

میجر ضمیر کی ہدایت پر ایمبولینس کے لیے پہلے ہی فون کیا جا چکا تھا۔ پانچ چھ منٹ بعد ہی ایک ایمبولینس فرخ کو تیزی سے فوجی اسپتال کی طرف لیے بھاگی جا رہی تھی۔ شہزاد نے بھی ساتھ جانا چاہا مگر میجر ضمیر نے کہا۔ ''اب یہاں آپ کا کام ختم ہو چکا ہے۔ آپ گھر جا کر اپنی مسز کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ کہیں وہ ناامیدی اور مایوسی میں کوئی غلط قدم نہ اٹھا لیں۔''

شہزاد اس مشورے کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہی جتنی جلدی ممکن ہو سکتا تھا گھر پہنچا۔ شہلا ٹیلیفون والے کمرے کے سامنے برآمدے میں بڑی پریشانی اور اضطراب کے عالم میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی۔ شہزاد کو دیکھتے ہی اس کی جانب لپکی۔

''میں نے اسپتال فون کیا تھا۔'' وہ بولی۔

''لیکن مجھے بتایا گیا کہ آپ کسی آرمی میجر کے

ساتھ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ وہ میجر کون تھا۔ آپ کس کے ساتھ گئے تھے۔"
"سکون سے بات کرو۔" شہزاد نے مسکراتے ہوئے بڑی نرمی سے کہا۔ "تم نے مجھے فون کیوں کیا تھا۔"
"میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی تھی۔" شہلا نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔
"فرخ اور فراز کے بارے میں۔" شہزاد بدستور نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔ یہ سنتے ہی شہلا بری طرح چونک پڑی۔
"تو...... تو اس نے آپ کو سب کچھ بتا دیا۔" وہ ہکلائی۔
"مجھے ان میں سے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔" شہزاد نے جواب دیا۔ "میری معلومات کے ذرائع کچھ اور ہیں۔"
اور پھر اس نے مختصر طور پر میجر ضمیر سے ملاقات ہونے سے لے کر استار ہوٹل کے حادثے تک سب کچھ بتا دیا۔ "میجر ضمیر نے حالات سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے۔ وہ درست ہی معلوم ہوتا ہے۔" اس نے آخر میں کہا۔ "لیکن ایک بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی ہے۔ فرخ، فراز کے بھیس میں تو تمہیں بلیک میل کرنے کی بڑی مضبوط پوزیشن میں تھا لیکن فرخ کی حیثیت سے اسے تم پر ایسا کیا ہولڈ حاصل تھا کہ تم اس کی دھمکی میں آ گئیں اور اس کے فون اور اس کی آمد کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کی۔"
"وہ مجھے دھمکی دے رہا تھا کہ جو خط میں نے فراز کو لکھے تھے۔ وہ آپ کو دکھا دے گا۔" شہلا نے بھیگی آنکھوں سے جواب دیا۔
"دکھا دیتا تو اس سے کیا ہوتا۔"
"میرے والدین نے آپ سے اور آپ کے گھر والوں سے میری پہلی شادی کی بات چھپائی تھی۔"
"سچ ہے لیکن شیرازی صاحب نے انتقال سے قبل مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔" شہزاد نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تمہاری پہلی شادی میجر فراز سے ہوئی تھی اور یہ کہ وہ بڑی دلیری سے دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو چکے ہیں۔"
"آپ، آپ جانتے تھے!" شہلا نے چونک کر شہزاد کی طرف دیکھا۔ اس کے لہجے میں حیرت اور خوشی نمایاں تھیں۔ "اس کا مطلب ہے کہ میں ایک ہفتے تک بلاوجہ ایک شدید ذہنی اور قلبی اذیت میں مبتلا رہی۔"
"یقیناً۔" شہزاد نے اپنے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ "اسی لیے دانشمندوں نے کہا ہے کہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپائیں تو ان کی نصف سے زیادہ پریشانیاں ختم ہو سکتی ہیں۔ تم نے اس کا تجربہ کر لیا اب آئندہ پھر کبھی ایسا مت کرنا۔ تم نہیں جانتیں کہ تمہاری وجہ سے میں کس قدر پریشان رہا ہوں۔"
شہلا قدم بڑھا کر ان پھیلے ہوئے بازوؤں میں سما گئی۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔
"ایک بات بتاؤ گی۔" شہزاد نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "یہ فرخ تمہیں کیسے جانتا تھا۔"
"پہلی شادی کے وقت جن دو رشتوں کو مسترد کیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک اس کا بھی تھا۔ یہ بات مجھے خود اس نے بتائی تھی ورنہ مجھے معلوم نہیں تھی۔"
"اس کا مطلب ہے کہ ابھی ایک ناکام امیدوار کی طرف سے ہنوز خطرہ باقی ہے۔" شہزاد کے لہجے میں شوخی تھی۔
"آپ ان کی فکر نہ کریں۔" شہلا مسکرانے لگی۔ "وہ میرے خالہ زاد بھائی تھے۔ ان کی شادی ہی نہیں دو بچے بھی ہو چکے ہیں۔"

⌖......⌖......⌖